دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۳ء عدد ۲

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

مصر میں فوجی بغاوت اور ملک کے پہلے منتخب صدر کی معزولی اور گرفتاری پر ایک مہینہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اب اخوان اور اس کا سیاسی بازو ممنوع ہے، اس کے متعدد رہنما گرفتار، اثاثے منجمد اور دفاتر سیل کر دیے گئے ہیں۔ ان کے اخبارات اور ٹی۔وی اسٹیشن بند کر دیے گئے ہیں۔ جو دستور ایک واضح اکثریت سے منظور کیا گیا تھا اسے کالعدم قرار دے دیا گیا ہے۔ جو لوگ الکشن میں ناکام رہے انہوں نے فوج کے کندھے پر سوار ہو کر ایوان اقتدار تک پہنچنے کا مختصر راستہ تلاش کر لیا ہے۔ معزول صدر اور اخوان کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں سے بعض میں کسی قدر صداقت بھی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہیں اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے یہ سزا نہیں دی گئی بلکہ اس کی اصل وجہ وہ اچھائیاں اور خوبیاں ہیں جن کے لیے یہ جماعت جانی اور پہچانی جاتی رہی ہے اور جن کی حفاظت کے لیے اس نے اپنی طویل تاریخ میں بڑی قربانیاں دی ہیں۔ شدید مخالفت اور مسلسل ظلم وستم کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود انہی کی وجہ سے اسے مصری معاشرہ میں یہ قبول عام حاصل ہوا۔ اس مقبولیت کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ دو سال کے عرصہ میں مصری عوام کو چھ مرتبہ اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کا موقع ملا۔ اس میں پارلیمنٹ کے لیے الکشن، صدارتی الکشن اور دستور کی منظور کے لیے ریفرنڈم شامل ہے۔ بغیر کسی استثنا کے ہر مرتبہ مصری عوام نے اس کی پالیسیوں کی بھرپور توثیق کی اور پارلیمنٹ میں اسے بھاری اکثریت سے کامیاب کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اخوان کی کامیابی کو مغربی طاقتوں اور ان کے مصری ہم نواؤں نے دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ الگ الگ اسباب کی وجہ سے کئی عرب ممالک کے لیے بھی یہ صورت حال قابلِ قبول نہیں تھی۔ دستور کی اسلامی اساس، اس میں اہانت رسولؐ پر سزا کی دفعہ، فلسطینیوں کی معاشی ناکہ بندی ختم کرنے کے لیے رفح کراسنگ کھولنے کا فیصلہ، اسرائیل کے ساتھ تعلقات میں تحفظات کا اظہار، ایران کے ساتھ تعلقات کی بحالی کی ابتداء، مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت، مرسی کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ ایک ایسے حساس خطے میں جس سے امریکہ اور یورپ کے غیر معمولی مفادات وابستہ ہیں اور جس سے اسرائیل کی بقا اور سلامتی کا مسئلہ جڑا ہوا ہے، وہاں اخوان جیسی جماعت کی بالادستی گوارا نہیں کی جاسکتی۔ فوجی بغاوت کی نسبت سے اب جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں ان سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مرسی کو ہٹانے کے لیے پہلے دن ہی سے تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی، برکلے کے ایک تحقیقاتی ادارے نے ناقابل تردید شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ نے Democracy Assistance Initiative کے پروگرام کے تحت مرسی مخالفین کو بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور یورپ مصر کے اس خونیں انقلاب کو فوجی بغاوت تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔ ترک حکومت کی طرف سے گیزی پارک مظاہرین کے خلاف آنسو گیس کے استعمال پر آنسو بہانے والی حکومتیں اور دن رات ان کی خبریں نشر کرنے والے مغربی ذرائع ابلاغ فوج کے ہاتھوں مرسی کے نہتے حامیوں کے قتل عام پر مہر بلب ہیں۔ پیغام واضح ہے۔ مسلم ممالک میں جمہوریت کے ذریعہ تبدیلی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ الجیریا، فلسطین اور اب مصر اس کا

ثبوت ہے۔ اس سے انتہا پسندوں کا موقف مضبوط ہوا ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلم ممالک میں جمہوریت کے ذریعہ کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اس کا صرف ایک راستہ ہے مسلح جدوجہد۔

گذشتہ کئی دہوں سے مصر میں اصل طاقت فوج کے ہاتھ میں رہی ہے۔ مصر کی جدید تاریخ کے تمام ڈکٹیٹر فوجی پس منظر رکھتے ہیں۔ گذشتہ ایک سال کے دوران جب بظاہر زمام اقتدار مرسی کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی طاقت کا اصل سرچشمہ فوج ہی تھی۔ مرسی کے ہاتھوں اعلیٰ فوجی سربراہوں کی برطرفی اور عبدالفتاح السیسی کے تقرر سے یہ تاثر ضرور ملتا تھا کہ اب فوج سویلین حکومت کے قابو میں آگئی ہے لیکن حقیقت واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس دام ہمرنگ زمین سے بہتوں نے دھوکہ کھایا۔ صدر مرسی اور اخوان کے لیے یہ تاثر بہت مہنگا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ فیصلہ کن طاقت اب بھی فوج کے ہاتھ میں تھی۔ بدلے ہوئے حالات کے تحت منظرنامہ میں تھوڑی سی تبدیلی کردی گئی تھی۔ جنرل سیسی امریکہ کے تربیت یافتہ ہیں اور مصری فوج کی روایت کے مطابق امریکہ اور اسرائیل سے ان کے مراسم نہایت گہرے ہیں چنانچہ امریکی اور اسرائیلی مفادات کی پاسداری کے معاملہ میں ان سے کسی سمجھوتہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ صدر مرسی اور اخوان کی سادہ لوحی اور ناتجربہ کاری تھی کہ انہوں نے فوج پر آنکھ بند کرکے بھروسہ کرلیا اور آخر تک جنرل سیسی کی وفاداری کی یقین دہانیوں پر بھروسہ کرتے رہے۔ ان کے پاس شاید اس کا کوئی متبادل بھی نہیں تھا۔ ۳۰ رجون کے مظاہرے جنہیں فوج نے مداخلت کے لیے جواز کے طور پر استعمال کیا طے شدہ منصوبہ کے مطابق تھے۔ تحریر اسکوائر میں جمع ہونے والے مظاہرہ نہیں کررہے تھے بلکہ مصر میں ابھرتی ہوئی جمہوریت کے قتل کا جشن منارہے تھے۔ اس جشن میں فوج برابر کی شریک تھی اور فضائیہ کے طیارے اپنے کرتب سے مجمع کا جی بہلا رہے تھے۔ تحریر اسکوائر میں مظاہرہ کرنے والوں کی تعداد پانچ سے آٹھ ملین تک بتائی گئی۔ دعویٰ کیا گیا کہ پورے مصر میں ۳۳ ملین افراد نے مرسی کے خلاف مظاہروں میں شرکت کی۔ چونکہ یہ مظاہرے ایک منصوبہ کے تحت منعقد کیے گئے تھے اور انہیں فوجی مداخلت کے لیے بہانہ کے طور پر استعمال کیا جانا تھا اس لیے دنیا نے اسے بے چون و چرا تسلیم کرلیا اور زمینی حقائق کی روشنی میں اسے جانچنے پرکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور اسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ قرار دیا گیا۔ اب جو معروضی تجزیے سامنے آرہے ہیں ان سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ تاریخ انسانی کا ایک بہت بڑا فراڈ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریر اسکوائر اور وہاں تک آنے والی سڑکوں پر مجموعی طور پر چار لاکھ سے زیادہ لوگوں کی سمائی ممکن نہیں۔ اندازہ ہے کہ اسی قدر لوگ مصر کے دوسرے شہروں میں ہونے والے مظاہروں میں شریک ہوئے۔ کہاں آٹھ لاکھ اور کہاں ۳۳ ملین۔ سب سے زیادہ آبادی والے عرب ملک میں آٹھ لاکھ افراد مملکت کے طول وعرض میں حکومت وقت کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں اور فوج یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ مصری قوم نے اپنی منشا اور خواہش کو واضح طور پر ظاہر کردیا ہے اور صدر کی معزولی اور حکومت کی برطرفی کے علاوہ اب کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہا۔ گذشتہ ایک مہینہ سے مصریوں کی ایک بڑی تعداد پورے ملک میں اس فیصلہ کے خلاف مظاہرہ کررہی

ہے۔مصری فوج کے نزدیک یہ عوام کی خواہش اور منشا کا اظہار نہیں ہے۔

مصر کے پیچیدہ سیاسی، معاشی اور انتظامی مسائل ماضی کا ورثہ تھے اور مختصر مدت میں ان کا حل ممکن نہیں تھا۔مختلف اسباب کے باعث شاید ان مسائل کی طرف اتنی سنجیدگی سے توجہ بھی نہیں دی جاسکی جتنی ضرورت تھی۔ اس محاذ پر ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مرسی ایسے افراد اور اداروں سے گھرے ہوئے تھے جو ہر قیمت پر ان کو ناکام بنانا چاہتے تھے۔فوج اور عدلیہ جن پر پرانے نظام کی اساس تھی اپنی جگہ موجود اور پوری طرح محفوظ تھے۔یہ دونوں ادارے پرانے ظالمانہ اور کرپٹ نظام حکومت کی حفاظت کے مقصد سے تشکیل دیے گئے تھے۔ان اداروں نے اصلاح احوال کی ہر کوشش کی مخالفت کی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے۔مرسی کو جو انتظامی ڈھانچہ ورثہ میں ملا تھا اور جس کے ذریعہ انہیں کاروبار حکومت چلانا تھا وہ حسنی مبارک کے تیس سالہ دور میں مخصوص مقاصد کے پیش نظر وضع کیا گیا تھا۔اس کو بدلنے کے لیے جو وقت اور تجربہ درکار تھا وہ میسر نہیں تھا۔اس نظام کو چلانے والوں کے پاس انتظام و انصرام حکومت کا طویل تجربہ تھا۔حکومت کے کل پرزوں کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے یہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا۔اس میں کام کرنے والے تمام کارکن اسی کرپٹ اور بدعنوان حکومت کے سایے میں پلے بڑھے تھے۔حکومت کے تمام کلیدی عہدوں پر ان کا قبضہ تھا اور ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے عدلیہ موجود تھی۔اس کے برخلاف اخوان کو حکومت چلانے کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا۔چنانچہ نہایت کامیابی سے اصلاح احوال کی تمام کوششوں کو سبوتاژ کیا جاتا رہا۔مثال کے طور پر یہاں بجلی اور گیس کی سپلائی کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے شدید بحران کو پیش کیا جاسکتا ہے۔اس سے عام شہریوں کی روزمرہ زندگی متاثر ہوئی اور مرسی کی حکمرانی کی اہلیت کے بارے میں منفی جذبات پروان چڑھے۔جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا یہ بحران سرتاسر خودساختہ اور مصنوعی تھا۔ملک میں نہ بجلی کی کمی تھی اور نہ گیس کی۔چنانچہ مرسی حکومت کے اختتام کے اگلے ہی دن اس کی سپلائی معمول پر آگئی۔یہ محض ایک مثال ہے ورنہ حسنی مبارک کے عہد کی باقیات نے کہاں کہاں اس طرح کا مصنوعی بحران پیدا کیا اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ان عناصر نے اپوزیشن کو بھی نہایت ہوشیاری سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور حکومت پر اپنی ڈھیلی پڑتی ہوئی گرفت کو پھر مضبوط کرلیا۔اپوزیشن آج پوری طرح فوج کی آلہ کار بنی ہوئی ہے اور خوش ہے کہ اس کی مدد سے وہ مرسی کو ہٹانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔جمہوریت، آزادی رائے اور انسانی حقوق جن کی علم برداری کا ان کو دعویٰ تھا، اب انہیں وہ یکسر فراموش کرچکے ہیں۔دوسری طرف انسانیت کا ایک جم غفیر ہے جو قاہرہ اور دوسرے شہروں میں شدید گرمی اور رمضان کے باوجود پوری پامردی سے میدان میں ڈٹا ہوا ہے۔منتخب صدر کی واپسی کے علاوہ کوئی اور متبادل ان کے لیے قابل قبول نہیں۔دھمکی، دباؤ اور غیر معمولی تشدد بھی ان کو وہاں سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔سینکڑوں جانوں کی قربانی کے باوجود بھی ان کے جوش اور جذبہ میں کوئی کمی نہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ ابتلا و آزمائش اخوان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔وہ اسی بھٹی میں تپ کر نکلے ہیں۔ان کے عزم اور پامردی کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ نامکمل انقلاب شاید ان کے ہاتھوں اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔

مقالات

عربی میں علم ہیئت کا آغاز وارتقاء
عہد مامون تک

پروفیسر مقصود احمد

عربوں کو ستاروں سے گومحدود حد تک ہی سہی، دور جاہلیت ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کے نکلنے اور ڈوبنے سے ان کو سمتوں کا اندازہ ہوتا تھا، بحر و بر کے سفروں میں رہنمائی حاصل ہوتی تھی اور رات میں وقت کے تعین میں بھی ان سے کافی حد تک مدد ملتی تھی۔ اہل عرب نے ستاروں کا علم کلدانیوں سے حاصل کیا تھا۔ ان سے متاثر ہوکر بعض قبائل عرب نے انسان کی زندگی پر ستاروں کے اثرات (Astral Influences) اور سعد ونحس کا عقیدہ بھی اختیار کرلیا تھا، یہاں تک کہ عطارد، مشتری وغیرہ کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمان عربوں نے بھی ان ستاروں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، مگر اس نمایاں امتیاز کے ساتھ کہ نہ تو انہوں نے کبھی ان کے اثرات نیک و بد پر اعتقاد رکھا اور نہ کبھی ان کی عبادت میں ملوث ہوکر عقیدہ توحید کو آلودہ کیا۔ انہوں نے ستاروں کا شمار ہمیشہ مخلوقات میں کیا اور ان کو انسان کے فائدے کے لیے خدائے واحد کی تخلیق کردہ قابل تسخیر اشیاء تصور کیا۔ چنانچہ رات کی نمازوں، سحری اور صبح صادق کے اوقات کے تعین اور سمت کعبہ معلوم کرنے کے سلسلے میں ان سے بڑا کام لیا گیا۔ علاوہ ازیں دور جاہلیت کے عربوں کی طرح، مسلمانوں نے بھی خشکی اور سمندر کے سفر میں ان کے ذریعے رہنمائی حاصل کی۔ رب ذوالمنن نے اس کی جانب قرآن حکیم میں درج ذیل الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستاروں کو

صدر، شعبہ فارسی، عربی واردو، بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ ۳۹۰۰۰۲، گجرات۔

لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۔(۹۸:۶) پیدا کیا تاکہ تم ان کے ذریعے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں راستہ معلوم کرسکو۔

دوسری جگہ ستاروں کے ذریعہ راستہ معلوم کرنے کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۔(۱۶:۱۶)

متعدد حدیثوں میں صلاۃ کسوف وخسوف کا ذکر آیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سورج گہن اور چاند گہن سے آگاہی عام تھی۔

خلافت راشدہ کے زمانے (۶۳۲ء-۶۶۰ء) میں بھی یہی صورت حال رہی۔ جہاں تک اموی عہد (۶۶۰ء-۷۵۰ء) کا سوال ہے، اس میں علم ہیئت (Astronomy) (۱) سے زیادہ علم نجوم (Astrology) (۲) کی جانب توجہ مبذول کی گئی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۸۵ء-۷۰۵ء) کو نجوم پر اتنا اعتقاد تھا کہ اپنے خاص نجومی (Astrologer) کے مشورے کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اور اموی دور کے آخر میں تو یہ دلچسپی اپنی حد کو پہنچ گئی تھی، یہاں تک کہ خلفاء اپنے زائچے (Tables) بنوانے لگے تھے، جیسا کہ ولید بن یزید (م ۷۴۴ء) کے حالات زندگی میں آتا ہے۔ (۳)

خالد بن یزید (م ۸۵ھ/۷۰۴ء) کو بھی علم نجوم (Astrology) سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس نے انفرادی طور پر مذکورہ علم سے متعلق بعض قبطی یا یونانی کتب یا رسائل کا ترجمہ بھی اپنے لیے عربی میں کرایا تھا، جواب موجود نہیں ہیں۔ (۴)

جہاں تک عباسی خلفاء کا تعلق ہے، وہ تو نجومیوں کے مضحکہ خیز حد تک معتقد تھے اور ایک طرح سے ان کو اپنا پیر تصور کرتے تھے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو، انہوں نے علم ہیئت (Astronomy) کے فروغ کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ اس سلسلے میں خلیفہ منصور (۷۵۴ء-۷۷۵ء) نے جو اہم سرپرستانہ کردار ادا کیا اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نجومیوں کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان میں سے ایک قابل ذکر نام نوبخت کا ہے۔ یہ اصلاً مجوسی تھا مگر بعد میں اس نے منصور کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ابوسہل الفضل بن نوبخت (م تقریباً ۸۱۵ء) کا نام آتا ہے۔

علم نجوم کے علاوہ منصور نے علم ہیئت کے فروغ کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ مبذول کی، جس کی وجہ سے اجرام فلکی کے سائنسی مطالعہ کی راہ ہموار ہوئی۔ اس نے محمد بن ابراہیم الفز اری (م درمیان ۷۹۶ء-۸۰۶ء) کو ہندوستانی ہیئت داں، برہم گپت (م ۶۶۰ء یا ۶۶۵ء) کی گراں قدر منظوم تصنیف ''برہم سپھٹ سدھانت'' (۵) (Brahma-Sphuta-Siddhanta) کو سنسکرت سے عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور ۷۷۱ء میں مذکورہ کتاب کا ترجمہ ''السند الہند'' کے عنوان سے کر کے اولین مسلم ہیئت داں ہونے کا قابل فخر اعزاز حاصل کیا (۶)۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ اس نے اس پنڈت کی مدد سے کیا ہوگا جو ہندوستان سے بغداد آیا تھا اور اپنے ساتھ منجملہ دیگر اشیاء کے ''سدھانت'' کا ایک نسخہ بھی لے آیا تھا (۷)۔ مامون کے زمانے تک اعمال کواکب میں اسی ترجمے پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

غالباً اسی زمانے میں محمد بن ابراہیم کے والد ابواسحاق ابراہیم بن حبیب الفز اری (م ۷۷۷ء) نے پہلی بار ایک اصطرلاب (Astrolabe) تیار کیا اور اس طرح وہ اولین مسلم اصطرلاب ساز ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ (۸)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک صراحت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم الفز اری نے بھی ''سدھانت'' کو اپنے طور سے عربی میں منتقل کیا تھا (۹)۔ علم ہیئت سے متعلق اس کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱-کتاب القصیدہ فی علم النجوم ۔ ۲-کتاب المقیاس للزوال ۔ ۳-کتاب الزیج علی سنی العرب ۔ ۴-کتاب العمل بالاسطرلاب (؟)۔ ۵-کتاب العمل بالاسطرلاب المسطح ۔(۱۰)

علاوہ ازیں سید صاحبؒ ہی کی تصریح کے مطابق ابراہیم الفز اری کے ہم عصر یعقوب بن طارق نے بھی سدھانت کا ترجمہ عربی میں اپنے انداز میں کیا تھا (۱۱)۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ۱۶۱ھ میں مذکورہ بالا پنڈت سے یا کسی اور آنے والے پنڈت سے ''الارکند'' یعنی کھنڈا کھڈیک (Khanda Khadyaka) کا طریقہ بھی سیکھا تھا (۱۲)۔ الارکند کا قدرے مفصل ذکر آگے آرہا ہے۔ علم ہیئت پر اس کی مشہور تصنیف کا نام ''ترکیب الافلاک'' (The Composition

(of the Spheres ہے ۔البیرونی نے کتاب الہند میں کئی جگہ یعقوب کی اس تصنیف کے مشمولات کی تفصیل فراہم کی ہے اور اس کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے (۱۳) ۔اس کی دوسری کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱-کتاب تقطیع کردجات الجیب ۔ ۲-کتاب ما ارتفع من قوس نصف النہار ۔ ۳-کتاب الزیج محلول فی السند ہند لدرجة درجة ۔(یہ دو کتابیں ہیں پہلی علم الفلک پر ہے اور دوسری کا تعلق علم الدول سے ہے)۔ **۴-کتاب المقالات** ۔(۱۴)

آخر الذکر ان خلفاء اور سلاطین کے زائچوں پر ہے جن کی تاریخ ہائے ولادت معلوم نہیں ہوسکیں (۱۵) ۔اس کا انتقال آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ۷۷۷/۸ء کے بعد کبھی ہوا۔

اس ضمن میں مزید دو نام قابل ذکر ہیں یعنی ماشاءاللہ یہودی اور علی بن عیسی الاصطرلابی۔ ابن ندیم نے اول الذکر کا نام ماشاءاللہ بیثی بن اثری لکھا ہے (دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۳) لیکن قفطی نے غالباً ماشاءاللہ بن ابری تحریر کیا ہے ۔اس کے برعکس یعقوبی نے اس کو ماشاءاللہ بن ساریہ مرقوم کیا ہے (دیکھیے کتاب البلدان، ص ۲۳۸ بحوالہ طبقات الامم، اردو ترجمہ، ص ۱۰۴)۔ مگران سب میں ابن ندیم کی تحقیق زیادہ درست معلوم ہوتی ہے ۔ماشاءاللہ بیثی خلیفہ منصور کے زمانے میں تھا اور مامون کے عہد تک زندہ رہا۔اسے علم ہیئت اور علم نجوم میں مہارت حاصل تھی۔ یہ کئی کتابوں کا مصنف تھا، جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ **کتاب الموالید الکبیر ، کتاب مطرح الشعاع ، کتاب صنعة الاسطرلابات والعمل بها ، کتاب ذات الحلق ، کتاب الامطار والریاح ، کتاب الموالید** اور **کتاب تحویل سنی الموالید** ۔(۱۶)اس کی بعض کتابوں کے لاطینی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

علی بن عیسی الاصطرلابی بھی منصور کے زمانے میں تھا اور اس کا انتقال مامون کے عہد میں ۸۳۰ء کے بعد کبھی ہوا۔جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ بھی اصطرلاب ساز تھا، اس نے اصطرلاب ضرور بنائے ہوں گے، مگر ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہوسکی ۔اس کا ایک اہم کارنامہ یہ

ہے کہ اس نے غالباً مامون کے زمانے میں کسی نامعلوم سنہ میں اصطرلاب پر ایک رسالہ سپرد قلم کیا تھا، جس کا شمار آلۂ مذکورہ پر تحریر کردہ چند ابتدائی تصانیف میں ہوتا ہے (۱۷)۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

''سدھانت'' کے بعد آریہ بھٹ (Aryabhatta-۴۷۶ء-۵۵۰ء)(۱۸) کی تصنیف آریہ بھٹیہ (Arbhattiya) کا ترجمہ عربی میں ''الارجبھد یا الارجبھذ'' کے عنوان سے ہوا۔ اسے الارجبھر اور الازجبھر بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کے مترجم کا نام ابوالحسن اہوازی تھا۔ (۱۹)

خلیفہ منصور کے عہد میں عربی میں منتقل ہونے والی تیسری سنسکرت کتاب کا نام ''کھنڈا کھڈیک'' تھا۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جسے برہم گپت نے ''سدھانت'' کے بعد سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں اس نے سدھانت سے جداگانہ اصول قائم کیے ہیں۔ اس کا عربی ترجمہ ''الارکند'' کے عنوان سے ہوا، جو البیرونی (م ۱۰۵۰/۵۱ء) کے زمانے تک موجود تھا۔ چونکہ یہ ترجمہ بہت مبہم اور مغلق تھا، اس لیے البیرونی نے اس کی اصلاح کر کے اس کا ایک نیا اور تصحیح شدہ اڈیشن تیار کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس وقت اس کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے (۲۰)۔ اس کا نام کہیں کہیں ''الاھرقن'' بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔

المسعودی (م ۹۵۷ء) کی صراحت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے زمانے میں بطلیموس (Ptolemy) کی ''المجسطی'' (Almagest) کا ترجمہ بھی یونانی سے عربی میں ہوا (۲۱)۔ پروفیسر حطی نے بھی History of the Arabs (ص ۳۱۱) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ المجسطی کا اولین عربی ترجمہ خلیفہ منصور کے عہد ہی میں ہوا۔ مگر اس کو قبول عام حاصل نہیں ہوسکا، جس کا سبب لفظی ترجمے کی ناہمواری اور عبارات میں موجود ابہام و اغلاق ہوسکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے بیٹے المہدی (۷۷۵ء-۷۸۵ء) کے عہد میں علم ہیئت کے فروغ کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اگرچہ اس کے عہد میں بھی نامور ہیئت داں موجود تھے اور ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر اس سلسلے میں کچھ کارنامے بھی انجام دیے ہوں، مگر حکومتی سطح پر ان کی ہمت افزائی کی کوئی مثال نظر سے نہیں گزری۔ مہدی کی تمام تر توجہ ملحدین

کی سرکوبی کی جانب رہی اور ابتداء میں سینکڑوں ہزاروں لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد بھی جب اسے بے لگام آزاد خیالی اور الحاد کے فتنے کو روکنے میں ناکامی ہوئی تو اس نے اس کو بالآخر علمی تلوار سے فرو کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے علمائے اسلام کو ملحدین کے رد میں کتابیں تصنیف کرنے کا حکم دیا۔اس کی وجہ سے ایک نئے علم کی بنیاد پڑی جو علم کلام کہلاتا ہے اور اس نے الحاد وزندقہ کے سیلاب کو روکنے میں اہم رول ادا کیا۔مختصر یہ کہ مہدی کے دور میں دیگر علوم وفنون کے مقابلے میں علم کلام کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

مہدی کے بعد الہادی تخت نشین ہوا۔ چونکہ اس کا عہد (۷۸۵ء-۷۸۶ء) بہت ہی مختصر تھا، اس لیے اس کو علوم وفنون کی ترویج وترقی کی طرف توجہ مبذول کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔اس کے عہد میں بھی علم کلام کی مرکزیت برقرار رہی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مہدی کی طرح اسے بھی فتنہ الحاد کے سیلاب کو روکنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑا اور علوم دخیلہ کے فروغ کے سلسلے میں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا، کیونکہ اس میں ذراسی بھی بے احتیاطی اور غیر ضروری نرمی فساد عقیدہ کا سبب ہوسکتی تھی۔

ہادی کے جانشین، ہارون الرشید کے دور اقتدار (۷۸۶ء-۸۰۹ء) میں صورت حال میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔اس کے زمانے میں علم ہیئت اور دیگر علوم کے ساتھ فلسفے کو بھی خاصا فروغ حاصل ہوا۔اس نے فلسفے سے متعلق یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا اور اس سلسلے میں اس نے یوحنا بن ماسویہ کی خدمات بطور خاص حاصل کیں۔اس کے عہد تک دیگر زبانوں (یونانی، فارسی، سریانی اور ہندی) کی تصنیفات کا جو بھی ذخیرہ جمع ہو چکا تھا، اس نے اس کو محفوظ کرنے کے لیے ایک عالی شان ''بیت الحکمۃ'' قائم کیا۔علاوہ ازیں اس کے عہد میں برمکیوں کی کوششوں کے طفیل، مناظرے کا بازار بھی گرم ہوا اور جگہ جگہ اس کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔جن میں ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد شرکت کرتے تھے۔لیکن فقہاء نے اس کی کھل کر مخالفت کی۔شروع میں تو ہارون رشید نے ان کی مخالفت کو کوئی اہمیت نہیں دی، مگر اخیر زمانے میں اس کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا اور مناظرے کی مجلسوں پر پابندی عائد کرنی پڑی، جس کی وجہ سے فلسفے کا بازار سرد پڑ گیا۔

لیکن علم ہیئت سمیت دیگر علوم کی ترقی کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ ہارون رشید اور اس کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی (م ۸۰۵ء) کو علم ہیئت سے خاصی دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے ان دونوں نے اس کے فروغ کے سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی۔ ہارون کے عہد میں یحییٰ برمکی کے زیر اہتمام المجسطی کا عربی میں دوبارہ ترجمہ ہوا۔ ابن ندیم کی فراہم کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ نے مذکورہ کتاب کے ترجمے پر ایک ساتھ کئی لوگوں کو مامور کیا۔ جب ان لوگوں نے اپنے اپنے ترجمے اس کے سامنے پیش کیے تو اس نے ان سب کو ناپسند کیا اور ابوحسان وسلمان کو ان کی اصلاح کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ان دونوں نے بہت سے اعلیٰ درجے کے مترجمین کو جمع کیا اور ان کے ترجموں کا باہم موازنہ و مقابلہ کر کے ایک فصیح ترین اور صحیح ترین نسخے کا انتخاب کیا۔ (۲۲)

علاوہ ازیں ہارون کے عہد میں علم ہیئت سے متعلق کچھ پہلوی (فارسی) کی کتابیں بھی فضل بن نوبخت (م ۸۱۵ء) کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوئیں۔ اسی زمانے میں ابوالحسن علی بن زیاد التمیمی نے شہریار کی زیچ (معروف بہ زیک شترواِیار Royal Astronomical Tables) کا ترجمہ ''زیج الشہریار'' یا ''زیج الشاہ'' کے عنوان سے عربی میں کیا۔ (۲۳)

حسن بن سہل اور سہل بن بشر بن ہانی بھی عہد ہارونی کے مشہور ہیئت دانوں میں ہیں۔ اول الذکر نے علم الانواء (۲۴) پر ''کتاب الانواء'' کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ثانی الذکر نے کئی کتابیں سپرد قلم کیں، جن میں سے بعض یہ ہیں: کتاب الہیئۃ وعلم الحساب، کتاب تحاویل سنی الموالید، کتاب تحویل سنی العالم، کتاب الاوقات، کتاب الامطار والریاح، کتاب الکسوفات، کتاب المدخل الکبیر، کتاب المدخل الصغیر۔ (۲۵)

ان دونوں کے علاوہ فضل بن نوبخت نے بھی جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے، علم ہیئت پر کچھ کتابیں تالیف کیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: کتاب النہمطان فی الموالید، کتاب الفال النجومی، کتاب الموالید، کتاب تحویل سنی الموالید، کتاب المدخل، کتاب المنتحل من اقاویل المنجمین فی الاخبار والمسائل والموالید۔ (۲۶)

علم ہیئت کی ترویج و ترقی میں ہارون کے بعد اس کے لائق فرزند، مامون (۸۱۳ء-۸۳۳ء) نے کچھ ایسے بے مثال کارہائے نمایاں انجام دیے جو سنہرے حروف سے لکھے جانے

کے قابل ہیں۔ایک تو یہ کہ بطلیموس(Ptolemy،۹۰ء-۱۶۸ء) کی المجسطی (Almagest) کا ترجمہ پھر عربی میں کرایا، جو عہد ہارونی کے ترجمے سے کہیں بہتر تھا۔ یہ فریضہ حجاج بن مطر نے ۸۲۷/۲۸ء میں انجام دیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آگے چل کر یعنی نویں صدی کے نصف آخر میں حنین بن اسحاق (م ۸۷۳ء) نے بھی اس کا ترجمہ عربی میں کیا، جس پر ثابت بن قرۃ (م ۹۰۱ء) نے نظر ثانی کی۔

دوسرے یہ کہ اس نے ابن خلف المروروذی سے ذات الحلق اور اصطرلاب تیار کرایا، جو رصد میں کافی معاون ثابت ہوئے۔

تیسرے یہ کہ ستاروں کے مشاہدات سے متعلق جندیسا پور میں جاری شدہ سرگرمیوں سے متاثر ہوکر اس نے ۲۱۴ھ میں بغداد میں بہ مقام شماسیہ اور اس کے بعد غالباً سنہ مذکور ہی میں دمشق میں بہ مقام قاسیون دو عظیم الشان رصدگاہیں (Astronomical observatories) قائم کیں اور قیمتی آلات رصد یہ مہیا کیے۔اول الذکر میں مامون کے ہیئت دانوں نے سند بن علی اور یحییٰ بن ابی منصور (م ۸۳۰/۳۱ء) کے زیر نگرانی نہ صرف اجرام فلکی کی حرکات کا مشاہدہ کیا، بلکہ المجسطی کے بنیادی عناصر کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ کرکے ان کی تصدیق بھی کی اور اس کے بعد انہوں نے الزیج الممتحن (Verified Tables) کے عنوان سے ایک زیچ بھی تیار کی۔ اس زیچ کو قطعی شکل دینے سے پہلے مذکورہ ہیئت دانوں نے قاسیون (دمشق) میں بھی متعدد تجربات و مشاہدات کیے۔ مذکورہ دونوں ہیئت دانوں کے علاوہ خالد بن عبدالملک مروروذی اور عباس بن سعید جوہری بھی شماسیہ کی رصدگاہ سے وابستہ تھے۔ان دونوں نے بھی علم ہیئت کے فروغ میں کافی کچھ کیا۔ان سب نے اجتماعی طور پر بیش قیمت آلات رصد یہ کی مدد سے آفتاب کے میل کا مقدار، اس کے مرکزوں کا خروج، اوج کے مواضع اور چند سیارات و ثوابت کے حالات دریافت کیے۔

قاسیون کی رصدگاہ سے جو ہیئت داں وابستہ تھے ان میں سناد، ابوالطیب اور ابن عیسیٰ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔علم ہیئت کی ترقی میں ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے طور پر کافی خدمات انجام دیں۔

چوتھے یہ کہ اس نے اپنے عہد میں کرۂ ارض کی پیائش کرائی، جسے اس کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس پیائش میں محمد، احمد اور حسن نے اہم کردار ادا کیا۔ علامہ شبلیؒ نے المامون میں ابن خلکان کی وفیات الاعیان (ترجمہ محمد بن موسی) کے حوالے سے اس کا قدرے مفصل ذکر کیا ہے، جو کچھ یوں ہے:

''(مامون نے) محمد (م ۸۷۳ء)، احمد و حسن (فرزندان موسی بن شاکر) کو جو اس کے خاص ندیم اور فنون و حکمت کی ترقی و اشاعت میں اس سے بھی کچھ زیادہ سرگرم تھے، حکم دیا کہ دربار میں جو ہیئت داں ماہرین فن ہیں، ان کو ساتھ لیں اور کسی ہموار اور وسیع صحرا میں آلات رصدیہ اور اصول حساب کے استعمال سے کرۂ زمین کی پیائش کریں۔ سنجار (Sinjar) کا مسطح اور وسیع میدان اس تجربے کے لیے نہایت مناسب مقام تھا۔ ان لوگوں نے پہلے ایک جگہ ٹھہر کر آلات رصدیہ کے ذریعے سے قطب شمالی کا ارتفاع معلوم۔ پھر وہاں ایک کھونٹی گاڑ دی اور ایک لمبی رسی اس میں باندھ کر ٹھیک شمالی کی سمت چلے۔ رسی جہاں ختم ہوگئی وہاں ایک دوسری کھونٹی گاڑ دی اور اس میں ایک ایک رسی باندھ کر پھر شمالی سمت کو چلے اور ایک جگہ ٹھہر کر رصد سے دیکھا تو قطب شمالی کا ارتفاع ایک درجہ بڑھ گیا تھا۔ اب جس قدر مسافت طے ہوئی تھی اس کی مساحت کی تو ٦٦ میل اور دو ثلث میل ٹھہری۔ اس سے نتیجہ نکالا کہ آسمان کے ہر ایک درجے کے مقابل زمین کی سطح ٦٦ میل اور دو ثلث ہے۔ پھر اسی مقام سے ٹھیک جنوب کی طرف چلے اور اسی طرح رسیاں باندھتے گئے۔ یہاں قطب شمالی کا ارتفاع لیا تو معلوم ہوا کہ ایک درجہ کم ہے۔ اب اس طرح حساب لگایا کہ ایک درجے کے مقابل زمین کی جو مسافت ٹھہری تھی، اس کو تین سو ساٹھ میں ضرب دیا، کیونکہ آسمان کے درجے اسی قدر قرار دیے گئے ہیں۔ اس حساب سے محیط زمین ۲۴ ہزار میل ٹھہرا''۔ (المامون، حصہ دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۱٦۷، ۱٦۸۔ نیز دیکھیے وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان۔ انگریزی ترجمہ M.de Slane مرتبہ

ڈاکٹر معین الحق، جلد پنجم، کتاب بھون، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۸، ۲۰۹)

سطور بالا میں فراہم کردہ تفصیلات کے مطالعے سے عربوں میں علم ہیئت کے آغاز اور عہد مامون تک اس کے ارتقاء کا ایک واضح خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔عہد مامون کے بعد بھی علم ہیئت کے شعبے میں کمی بیشی کے ساتھ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔آگے چل کر گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے اپنی گراں قدر اور قابل ستائش تحقیقات کے ذریعہ اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے پیش رووں کی اغلاط کی تصحیح بھی کی، متعدد اضافے بھی کیے اور مایہ ناز کتابیں تصنیف کیں، جن سے یوروپی ہیئت دانوں نے بھی رہنمائی حاصل کی۔اس حقیقت کی جانب راقم الحروف اپنے ایک مکتوب مشمولہ آجکل (مارچ ۲۰۰۹ء) میں اشارہ کر چکا ہے۔اس موضوع پر آیندہ کبھی ایک بھرپور مضمون سپرد قلم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مشرق کے علاوہ مغرب یعنی مسلم اسپین میں بھی علم ہیئت کے فروغ کی جانب خاصی توجہ مبذول کی گئی۔یہ ایک مستقل باب ہے۔اس موضوع پر راقم الحروف شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ سمینار (۲۵-۲۶/مارچ ۲۰۱۰ء) میں Astronomy in Muslim Spain کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کر چکا ہے، جس میں ابوالقاسم مسلمہ المجریطی (م درمیان ۱۰۰۴ء و ۱۰۰۷ء)، ابواسحاق ابراہیم بن یحییٰ الزرقانی (م ۱۰۸۴ء)، جابر بن افلح (م درمیان ۱۱۴۰ء و ۱۱۵۰ء) اور نورالدین البطروجی (م ۱۲۰۴ء) کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔یہ مقالہ مذکورہ سمینار کی شائع شدہ Proceedings (مارچ ۲۰۱۱ء) میں شامل ہے۔اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا، تاہم اس موضوع پر مزید تحقیق وجستجو اور جگر کاوی کی ضرورت ہے۔

تعلیقات وحوالہ جات

(۱) Astronomy کو عربی میں ''علم الہیئۃ'' Science of the Aspect (of the Universe) کہتے ہیں۔اسے ''علم الفلاک'' (Science of clestial Spheres) بھی کہا جاتا ہے، اس کے عالم کے لیے ''فلکی'' (Astronomer) کی اصطلاح رائج ہے۔یہ علم یوں تو ستاروں کے حرکات کے مشاہدہ ومطالعہ پر

مشتمل ہے مگر پنج وقتہ نمازوں کی صحیح وقت پر ادائیگی کے پیش نظر شب و روز کے اوقات معلوم کرنے کا علم ''یعنی علم المیقات'' یا ''علم المواقیت'' (Science of the Fixed Time) بھی اس کے تحت آجاتا ہے۔ (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول، لائڈن، ۱۹۱۳ء، ص ۴۹۷، ۴۹۸)۔

(۲) Astrology انسانی زندگی اور دنیا میں رونما ہونے والے حالات پر ستاروں کے اثرات کے مطالعے پر مبنی ہے۔ عربی میں اس کو ''علم احکام النجوم'' (The Science of the Decrees of the Star یا صناعۃ قضایا النجوم (The Art of the Decrees of the Stars) یا مختصراً علم (صناعۃ) الاحکام کہا جاتا ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے بعض مسلم دانشوروں نے ''علم النجامۃ'' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ اس علم کے ماہر کو ''احکامی'' یا ''منجم'' (Astrologer) کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی تک ماہر علم ہیئت (Astronomer) کو بھی منجم کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مسعودی نے مروج الذہب میں نو بخت ابراہیم الفزاری علی بن عیسی الاصطرلابی وغیرہ کے ناموں کے ساتھ لفظ منجم کا استعمال کیا ہے (دیکھیے جلد چہارم، بیروت ۱۹۸۳ء ص ۲۲۳)۔ مگر انیسویں صدی عیسوی سے Astrologer اور Astronomer کے مابین فرق کیا جانے لگا اور اول الذکر کے لیے منجم اور آخر الذکر کے لیے فلکی کا استعمال عام ہوگیا (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول، ص ۴۹۴)۔ آخر میں ایک بات اور وہ یہ کہ شروع میں Astrology اور Astronomy کے لیے علاحدہ علاحدہ طور پر یا دونوں کے لیے یکجا طور پر بلا تفریق علم (یا صناعۃ) النجوم، علم صناعۃ النجوم، علم التنجیم کی اصطلاحات بھی رائج تھیں۔ (ایضاً)

(۳) دیکھیے ندوی، عبدالحلیم، عربی ادب کی تاریخ، جلد سوم، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۴۰۸۔

(۴) دیکھیے ابن الندیم، کتاب الفہرست، الجزء العاشر، طہران، ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۹ اور جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، الجزء الثالث، بیروت، تاریخ درج نہیں، ص ۱۵۰۔

(۵) یہ کتاب ۶۲۸ء میں راجہ دیا گرمکھ (Dayagurumukh) کے لیے تصنیف کی گئی تھی۔ یہ ۲۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے دو ابواب علم حساب پر ہیں اور بقیہ کا تعلق علم ہیئت سے ہے، جن میں سورج گہن (Solar Eclipse)، چاند گہن (Lunar Eclipse)، ستاروں کے اقتران اور ان کے حرکات و منازل وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔ کتاب مذکور ''برہم سدھانت'' اور سوریہ سدھانت کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اصل کتاب سدھاکر دویدی کی کوششوں سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوچکی ہے۔ مگر اس کا عربی ترجمہ نایاب ہے (مزید معلومات

کے لیے دیکھیے صاعد اندلسی، طبقات الامم، اردو ترجمہ ۱۳۴۶ھ، ص ۱۵؛ The New Encyclopaedia Britannica جلد دوم، شکاگو، ۱۹۹۷ء، ص ۴۶۱؛ The Encyclopaedia Americana جلد چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۴۱۰؛ The Columbia Encyclopaedia، نیویارک، ۱۹۵۰ء، ص ۲۴۲ اور مقبول احمد Indo-Arab Relations، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۔

(۶) دیکھیے History of the Arabs, P.K.Hitti، لندن ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۷ و ۳۷۳، نیز دیکھیے طبقات الامم، اردو ترجمہ از اختر جوناگڑھی، اعظم گڑھ ۱۳۴۶ھ، ص ۱۵، ۸۵، ۸۶، ۱۰۳؛ مقالات شبلی، جلد ششم، اعظم گڑھ، مقام تاریخ کردہ خوردہ، ص ۱۰۱، ۱۰۲۔ متاخرین نے مذکورہ عربی ترجمے کا نام "السند ھند الکبیر" لکھا ہے۔ اس کی وجہ آگے بتائی جائے گی۔

(۷) اس کے برعکس سید سلیمان ندویؒ نے "عرب و ہند کے تعلقات" (اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۵، ۱۳۷) میں قفطی کی تصنیف اخبار الحکماء (مصر، ص ۱۷۷) کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ "سدھانت" کو عربی میں اس ہندوستانی پنڈت نے بذات خود منتقل کیا تھا اور اس میں اس نے ابراہیم فزاری سے مدد لی تھی۔ مگر ان کی یہ تحقیق درست نہیں معلوم ہوتی۔ اس سلسلے میں پروفیسر مقبول احمد صاحب کا بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہندوستان سے علم حساب اور علم ہیئت کی کتابیں آئیں تو خلیفہ منصور کے حکم کے مطابق وہ سب پنڈتوں کی اعانت سے مسلم علماء کے ذریعے عربی میں منتقل کی گئیں (دیکھیے Indo-Arab Relations، ص ۱۰)۔ آگے چل کر تو انہوں نے یہ واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ "سدھانت" کا عربی ترجمہ الفزاری (؟) نے کیا تھا۔ (دیکھیے ص ۱۱)۔ اس عبارت میں صرف الفزاری تحریر ہے، جس سے یہ عیاں نہیں ہو پاتا کہ اس سے مقبول صاحب (۱۹۲۱ء-۱۹۹۸ء) کی مراد محمد بن ابراہیم الفزاری ہے یا ابراہیم بن حبیب الفزاری۔ لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی پنڈت کی حیثیت مترجم کی نہیں بلکہ معاون کی تھی۔ مقبول صاحب کی مذکورہ کتاب کے ص ۱۲ پر ابراہیم بن حبیب الفزاری کا ذکر "کتاب الزیج" کے مولف کی حیثیت سے آیا ہے، جسے ۷۸۶ء کے بعد کی تالیف قرار دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع محل نظر ہے کیونکہ ابراہیم کا انتقال اس سے بہت پہلے ۷۷۷ء میں ہو چکا تھا۔ صاعد اندلسی، جرجی زیدان، علامہ شبلی اور حطّی نے محمد بن ابراہیم الفزاری کو ہی سدھانت کا اصل عربی مترجم تسلیم کیا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اتنے شواہد کی موجودگی میں محمد الفزاری کے علاوہ کسی اور کو عربی مترجم ماننا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک محمد بن ابراہیم الفزاری اور ابراہیم بن حبیب الفزاری

کے مابین رشتے کا تعلق ہے، وہ ان کے ناموں سے عیاں ہے یعنی اس کی نوعیت باپ اور بیٹے کی تھی۔ محمد کے علاوہ، ابراہیم کا ایک اور بیٹا تھا، جس کا نام اسحاق تھا۔ اسی لیے ابراہیم کی کنیت ابواسحاق تھی اور اس کا پورا نام ابو اسحاق ابراہیم بن حبیب الفزاری تھا۔ (دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۱۸۸، ۳۳۳)۔ اس ضمن میں مولانا ابو الکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) کی رائے کو پیش کرنا بھی کچھ غیر مناسب نہ ہوگا، موصوف کے نزدیک سدھانت کے عربی مترجم کا نام ابراہیم بن الحبیب الفزاری تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس کو عربی کے پہلے زیچ (Astronomical Tables) کا مرتب بھی قرار دیا ہے۔ مولانا نے قول اول کی تائید میں ''کتاب الہند'' (ص ۲۰۸) از البیرونی اور ''تاریخ الحکماء'' (مطبوعہ لیزک، ص ۲۷۰) از قفطی کا حوالہ دیا ہے (دیکھیے البیرونی اور جغرافیہ عالم، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۰)۔ قفطی کی کتاب کا ایک حوالہ اوپر گزر چکا ہے جس میں ہندوستانی پنڈت کو سدھانت کا اصل عربی مترجم قرار دیا گیا ہے۔ ایک ہی کتاب میں دو مختلف بیانات کی وجہ سمجھ نہیں آتی لیکن چونکہ یہ کتاب اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے، اس لیے اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ عرض کرنا غیر ممکن ہے۔ جہاں تک ''کتاب الہند'' کا تعلق ہے، اس کا اردو ترجمہ از سید اصغر علی (جلد دوم، دہلی، ۱۹۴۲ء) میرے پاس موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس کا مختصر انگریزی ترجمہ از ڈاکٹر سخاؤ (Sachau) بہ عنوان "India-Al-Biruni" (مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۳ء) بھی میری تحویل میں ہے، جو پروفیسر قیام الدین احمد کا مرتبہ ہے۔ اول الذکر میں کوئی پانچ جگہ یہ نام میری نظر سے گزرا مگر ہر جگہ صرف ''الفزاری'' تحریر ہے اور کہیں بھی پورا نام مرقوم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے صفحات ۹، ۱۰ (دوبار) ۱۴۶، ۱۵۱۔ یہی صورت حال انگریزی ترجمے کی ہے۔ اس میں بھی کوئی چھ مقامات (دیکھیے ص ۹۷، ۱۳۸، ۱۹۴ دوبار ۱۹۵، ۱۹۷) پر صرف الفزاری لکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل عربی نسخے میں بھی یہ نام مکمل طور پر نہیں لکھا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے خدا جانے کس بنیاد پر ''الفزاری'' کو ابراہیم بن الحبیب الفزاری تصور فرمالیا ہے، یہ محمد بن ابراہیم الفزاری بھی تو ہوسکتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ انگریزی ترجمے کے آخر میں شامل شدہ اپنے ایک حاشیے میں پروفیسر قیام الدین احمد نے محمد بن ابراہیم الفزاری ہی لکھا ہے (دیکھیے ص ۲۸۲، حاشیہ نمبر ۳۳)۔ اس سے یہ بالکل واضح ہے کہ پروفیسر موصوف کے نزدیک الفزاری سے ابراہیم بن حبیب الفزاری نہیں بلکہ محمد بن ابراہیم الفزاری مراد ہے۔ ان کے خیال کی تائید دیگر معتبر مآخذ سے بھی ہوتی ہے، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اولین ترجمے کے بعد ابراہیم الفزاری نے بھی سدھانت کا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(۸) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۲ اور History of the Arabs، ص ۳۷۵۔

(۹) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷۔ (۱۰) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۲۔

(۱۱) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷۔ Carra de Vaux نے اس کا نام یعقوب الفزاری لکھا ہے جو قطعاً غلط ہے، دیکھیے Astronomy and Mathematics مشمولہ The Legacy of Islam مرتبہ Thomas Arnold و Alfred Guillaume، لندن، ۱۹۴۳ء، ص ۳۸۰۔

(۱۲) ایضاً، ص ۱۳۹۔ (۱۳) تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب الہند اردو ترجمہ از سید اصغر علی، ج ۲، دہلی، ۱۹۴۲ء، ص ۶۰، ۱۴۶، ۱۵۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۲۰۷، ۲۰۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷۔ (۱۴) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۶۔

(۱۵) دیکھیے طبقات الامم، اردو ترجمہ، ص ۱۰۳۔ (۱۶) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۳۔

(۱۷) دیکھیے History of the Arabs، ص ۳۷۵۔

(۱۸) Aryabhatta کی پیدائش پٹنہ کے قریب واقع ایک مشہور مقام 'کسم پورہ' میں ہوئی تھی۔ اس کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ کم عمری ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی گراں قدر منظوم کتاب ''آریہ بھٹیہ'' ۴۹۹ء میں تصنیف کی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۳ سال تھی۔ اٹھارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب علم ہیئت اور حساب سے متعلق ہے۔ اس میں منجملہ دیگر اشیاء کے سورج گہن اور چاند گہن کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ آریہ بھٹ پہلا ہندوستانی فلکی (Astronomer) تھا جس نے یہ بتایا کہ زمین مدور ہے اور یہ اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اسے وقت شماری کے دو مخصوص نظاموں کے رائج کرنے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اپنی خداداد لیاقت و صلاحیت کی بنا پر اس نے حساب اور علم ہیئت میں کافی شہرت حاصل کی۔ بعض محققین کے مطابق وہ مشہور نالندہ یونیورسٹی کا Kulapa (وائس چانسلر) بھی ہوا، جسے اس زمانے میں بہت بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا (مزید معلومات کے لیے دیکھیے Britannica Ready Reference Encyclopaedia، جلد اول، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۵؛ The New Encyclopaedia Britannica، جلد اول، شکاگو، ۱۹۹۷ء، ص ۶۱۱ اور The Encyclopaedia Americana، جلد دوم، U.S.A.، ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۵)۔

(۱۹) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷، ۱۳۹؛ مقبول احمد Indo-Arab Relations, ص ۱۱، اور India-Al-Biruni، ص ۱۹۵۔

(۲۰) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷، Indo-Arab Relations, ص ۱۱، The Columbia

Encyclopaedia، نیو یارک، ۱۹۵۰ء، ص۲۴۲؛ The Encyclopaedia Americana، جلد چہارم، U.S.A. ۱۹۸۴ء، ص۴۱۰ اور طبقات الامم اردو ترجمہ، ص۱۷، حاشیہ۴ از قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی۔

(۲۱) دیکھیے مروج الذہب، ج۴، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص۲۲۳ اور تاریخ التمدن الاسلامی، ج۳، ص۱۵۲۔

(۲۲) دیکھیے کتاب الفہرست، ص۳۲۷ نیز دیکھیے مقالات شبلی، ج۶، ص۲۱ اور تاریخ التمدن الاسلامی، ج۳، ص۱۵۴۔ (۲۳) دیکھیے کتاب الفہرست، ص۳۰۵؛ تاریخ التمدن الاسلامی، ج۳، ص۱۶۲؛ طبقات الامم اردو ترجمہ، ص۲۳، حاشیہ نمبر ۱، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ج۱، ص۴۹۸۔ (۲۴) ''انواء'' علم ہیئت و نجوم کا اصطلاحی لفظ ہے۔ اس سے وہ ستارے مراد ہیں جن میں سے ایک کے طلوع ہونے کے وقت دوسرا غروب ہوتا ہے اور وہ ستارے بھی جن کا طلوع ہونا بارش ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جن کتابوں میں ان ستاروں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے ان کو ''کتب الانواء'' کہتے ہیں (دیکھیے کتاب الہند، اردو ترجمہ، ج۲، دہلی، ۱۹۴۲ء، ص۲۳۹، حاشیہ از مولوی سید عطا حسین)۔ (۲۵) دیکھیے کتاب الفہرست، ص۳۳۳۔ (۲۶) ایضاً۔

فکر اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور علامہ اقبال

ڈاکٹر سید عبدالباری

بیسویں صدی میں مغرب کے فلسفوں نے مشرق کے نظام فکر کی، یہ محسوس ہو رہا تھا کہ چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ علامہ اقبال اور دیگر مفکرین اسلام اس صورت حال پر مضطرب تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے صفحات پر اسلامی علوم اور قرآنی فکر و فلسفہ کی عصر رواں میں اہمیت اور معنویت کو پورے خروش کے ساتھ پیش کیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا سے مارکس کے جدلیاتی فلسفہ اور اشترا کی تصور حیات و کائنات تک کا ہر طرف بول بولا تھا اور نئی نسل کا ایک بڑا طبقہ مشرق و مغرب میں مذہب کو انسانی زندگی کے مسائل و امور سے خارج از بحث قرار دے رہا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنی فارسی و اردو زبان میں شاعری کے ذریعہ مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کی لایعنیت اور عصر حاضر میں قرآن کی افضلیت کا نغمہ چھیڑا۔ علامہ نے خطبات مدراس کے ذریعہ اسلامی فکر و فلسفہ کی تدوین نو کے ولولے کو صفحہ قرطاس پر نمایاں کیا۔ پھر بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ان کے سینے میں جو چنگاریاں روشن ہوئی تھیں ان کو بڑے اضطراب کے ساتھ نمایاں کیا۔ علامہ جن موضوعات پر قلم اٹھانے کے لیے بے چین تھے ان کی تفصیلات ہمیں چونکا دیتی ہیں۔ علامہ اپنے دوست سر راس مسعود کو ۲۰/مئی ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں:

> ''چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں اور جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اس خدمت دین کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں''۔ پروفیسر

۳۲/ای شاہین باغ، نئی دہلی۔

رفیع الدین ہاشمی اپنے مقالہ ''اقبال کے ذوق علم وتحقیق'' میں رقم طراز ہیں :

''نہیں کہا جاسکتا کہ موعودہ کتاب میں اقبال کیا طریق تفسیر اختیار کرتے لیکن اس سلسلہ کی بعض تحریروں اور گفتگوؤں سے پتہ چلتا ہے کہ مقدمۃ القرآن لکھنے سے ان کی بنیادی غایت خدمت دین تھی اور اپنی موعودہ کتاب میں وہ امت مسلمہ کو قرآنی رموز ونکات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمانان عالم اس کی روشنی میں اپنے سیاسی ومعاشی مسائل حل کرسکیں ۔ وہ یہ بھی ارادہ رکھتے تھے کہ اسلام اور قرآن پر یورپ کے متعصّبانہ اور بے بنیاد اعتراضات کا مدلل جواب دیا جائے ۔ اگر اقبال مقدمۃ القرآن لکھنے میں کامیاب ہوجاتے تو بلاشبہ عصر حاضر میں یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوتا'' ۔ (اقبال ریویو حیدرآباد، ص ۳۶، نومبر ۲۰۰۹ء)

اقبال کا دوسرا منصوبہ اسلامی فقہ کی تدوین جدید کا تھا ۔ بقول رفیع الدین ہاشمی یہ علامہ کی سب سے بڑی خدمت ہوتی ۔ صوفی تبسم کے نام ۲؍ستمبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں ''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نگاہ سے زمانہ حال کے اصول قانون پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا ۔ (اقبال ریویو حیدرآباد، رفیع الدین ہاشمی، ص ۳۶)

علامہ اقبال فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ پر سخت زور دیتے تھے اور اس پر خود کام شروع کیا تھا ۔ انہوں نے ایک کتاب Islam as I understand it لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا فقہ کی تدوین کے لیے انہوں نے مولانا شبلی ، سید سلیمان ندوی اور سید انور شاہ کشمیری کو لاہور بلانا چاہا تھا ۔ (اقبال نامہ، ص ۱۲۵، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی لاہور) ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی کی اشاعت پر ان کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا ۔ انہوں نے تصوف پر ایک کتاب لکھنی شروع کی مگر ایک دو باب ہی لکھ سکے ۔ اقبال کی علمی منصوبوں میں بہت سے موضوعات شامل تھے مثلاً فصوص الحکم پر ایک تنقیدی جائزہ ، قلب و دماغ کی سرگذشت وغیرہ ۔ بقول رفیع الدین ہاشمی اقبال کے ان منصوبوں کا محرک ملی انحطاط کا وہ شدید احساس تھا جس نے اقبال کو ساری عمر مضطرب رکھا اور وہ تصنیفی منصوبوں کے ذریعہ چاہتے تھے کہ اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اثرات

منکشف کر جائیں تا کہ وہ دین کے قریب آجائیں۔(اقبال نامہ بحوالہ علامہ اقبال شخصیت اورفن، رفیع الدین ہاشمی،ص ۲۴۲، لاہور)

اقبال کو یہ احساس تھا کہ بڑے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے اجتماعی کاوشوں، علمی اداروں اور اکیڈمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، جیسا کہ یورپ میں ہورہا ہے، اقبال کے ایک نیازمند خواجہ عبد الوحید نے ۱۹۲۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تا کہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تمدن و تاریخ کے مطالعہ کی طرف راغب کیا جائے۔علامہ اقبال کو اس ادارہ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس سے کافی دلچسپی لکھتے تھے اور اس کے کاموں میں علمی تعاون کرتے تھے۔(مجالس اقبال،جعفر بلوچ، دارالتذکیر لاہور،۲۰۰۳ء)

پھر علامہ کی راہنمائی میں ۱۹۳۱ء میں علوم اسلامیہ کی ترویج و تحقیق کے لیے لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ قائم کیا گیا۔اس کے تمام کام ان کی راہنمائی میں انجام پاتے تھے۔اقبال کو بقول جعفر بلوچ اس ادارہ سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔اس کے لیے علامہ نے ریاست حیدرآباد سے سالانہ امداد بھی منظور کرائی تھی۔ بقول عبدالمجید سالک ''مدت دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کررہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی و دنیوی علوم کے ماہر جمع کیے جائیں اور ان ماہروں کو خورد ونوش کی فکر سے آزاد کردیا جائے تا کہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخ اسلام اور شرع اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھی جائیں جو آج کل کی دنیائے فکر میں انقلاب پیدا کردیں''۔(عبدالمجید سالک، بزم اقبال لاہور ۱۹۵۵ء)

صاحب زادہ آفتاب احمد کے نام ایک خط میں وہ اسلامی تاریخ، آرٹ، قانون اور تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی عالموں کی تیاری، ان کی تعلیم و تربیت اور اسلامی ادبیات و افکار میں تحقیق کی ضرورت کا ذکر کرتے ہیں۔(اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، لاہور)

اس سلسلہ میں اپنے آخری دور میں علامہ کی ترجیحات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''یہاں ایک دلچسپ نکتے کی نشان دہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ آخری زمانے میں

اسلامی فقہ میں تحقیق کا مسئلہ اقبال کی نظر میں جس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا، فلسفہ وتصوف جیسے موضوعات اسی قدر ان کی نظر سے گر گئے تھے۔علمی زندگی خصوصاً مسلم نشاۃ ثانیہ کے ضمن میں فلسفے اور تصوف کی افادیت ان کی نظر میں مشکوک ہوگئی تھی۔ پروفیسر عمر الدین کے نام ۸/مئی ۱۹۳۶ء کو لکھتے ہیں: مسلم فلسفے اور تصوف جیسے موضوعات میں میری زیادہ تر دلچسپی ختم ہوگئی ہے۔ اسلامی فقہ کے وہ اصول وضوابط جن کا تعلق معاملات سے ہے اور جو دنیا کی اقتصادی اور تہذیبی تاریخ کے نقطہ نظر سے کہیں زیادہ اہم ہیں ان کے مقابلہ میں فلسفہ اور تصوف فقط قیاس آرائی (Mere Speculation) کی حیثیت رکھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر یہ اسلام میں انتشار اور افتراق کا سبب بھی بنتے ہیں''۔(نقوش اقبال نمبر دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۸)

چنانچہ وہ ضرب کلیم کی نظموں میں فلسفہ وخانقاہی تصوف پر اظہار خیال کرتے ہیں ؂

ہے فلسفہ زندگی سے دوری   انجام خرد ہے بے حضوری
مست رکھو ذکر وفکر صبح گاہی میں اسے   پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

۹/جنوری ۱۹۲۸ء کو پورے ملک میں یوم اقبال منایا گیا۔اس موقع پر سرسکندر حیات نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر جگہ اقبال کو کیسۂ زر پیش کیا جائے۔علامہ نے یہ تجویز مسترد کردی اور کہا کہ بہتر ہوگا اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے ایک چیئر یا خصوصی شعبہ قائم کیا جائے اور سرمایہ اس کے لیے فراہم کیا جائے۔ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اقبال کی یہ اہم تمنا تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پرسکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں بہترین دل ودماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، تاریخ فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کرکے علوم جدیدہ کا علوم قدیمہ سے تعلق دریافت کرسکیں۔(سرگزشت اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید بحوالہ رفیع الدین ہاشمی، اقبال ریویو، ۲۰۰۹ء)

اسی زمانہ میں چودھری نیاز علی جیسے دردمند کا اپنی جائیداد واقع جمال پور پٹھان کوٹ ضلع گرداس پور کا ایک حصہ خدمت دین کے لیے وقف کرکے وہاں درس گاہ قائم کرنے کے عزم کا اظہار نیک فال ثابت ہوا۔چودھری صاحب نے کئی علماء سے راہنمائی چاہی۔مولانا مودودیؒ

سے ان کی مفصل خط و کتابت ہوئی اور انہوں نے ایک تفصیلی نقشہ بنا کر انہیں ارسال کیا جس میں انہوں نے علمی کام کے چار شعبے (فقہ، معاشیات، علوم عمران، فلسفہ اور نظری سائنس) کی نشان دہی کی اور یہ لکھا ''سب علمی و تحقیقی کام اس بنیادی نظریہ سے کیا جائے کہ قرآن وسنت ہی علم کا اصل منبع ہے۔ سب کچھ ہم کو اسی سے لینا ہے''۔ (اقبال دارالسلام اور مودودی، اسعد گیلانی)
چودھری نیاز نے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے ارادہ سے آگاہ کیا اور دارالسلام کے منصوبہ پر روشنی ڈالی۔ علامہ بے حد خوش ہوئے اور انہیں بقول رفیع الدین ہاشمی اس منصوبہ میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔ علامہ نے پٹھان کوٹ کے علمی مرکز کے لیے جامعہ ازہر کے علامہ مصطفیٰ المراغی کو خط لکھا، یہ نہایت اہم مکتوب ہے:

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایسے ادارہ کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور انشاءاللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں جنہیں علوم دینی میں مہارت حاصل ہو اور جو اپنا وقت دین اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں۔ ہم ان لوگوں کے لیے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شور و شغب سے دور ایک دارالاقامہ بنا دیں جو ان لوگوں کے لیے ایک اسلامی مرکز کا کام دے۔ اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں جن کی ضرورت پیش آسکتی ہو۔ مزید براں ان کے لیے ایک کامل و صالح گائیڈ کا تقرر کیا جائے جسے قرآن حکیم میں بصیرت تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہو تاکہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ و حکمت، اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکر اسلامی کی تجدید کے سلسلہ میں انہیں مدد دے سکے تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور قلم سے اسلامی تمدن کے احیاء کے لیے کوشاں ہوسکیں۔ آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت کو واضح

کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں۔ یہ شخص علوم شرعیہ نیز تاریخ وتمدن اسلامی میں کامل دست گاہ رکھتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو'۔ (۳۹ خطوط مودودی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، خطوط اقبال، رفیع الدین ہاشمی کی زبان ادبی لاہور، ۱۹۷۶ء)

شیخ الازہر نے جواب دیا کہ ہمارے علمائے ازہر میں کوئی ایسا نہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔ سید نذیر نیازی اور میاں محمد شفیع کے بقول علامہ کی نظر سے مولانا مودودی کی تحریریں گذر چکی تھیں اور ان کے علم اور فہم اسلام سے علامہ مطمئن تھے۔ انہوں نے چودھری نیاز کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا مودودی کو پٹھان کوٹ بلائیں۔ مولانا مودودی نے اس دعوت کو قبول کیا اور لاہور آکر چودھری نیاز علی خاں اور علامہ محمد اسد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملاقات کی اور مجوزہ ادارہ کے منصوبوں، منہاج اور طریقہ کار پر علامہ سے مفصل بات چیت کی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد دکن سے جمال پورہ پٹھان کوٹ منتقل ہوگئے، خود علامہ اقبال کا ارادہ تھا کہ ہر سال چند ماہ وہاں آکر قیام کریں۔ مولانا مودودی مشورہ وراہنمائی کے لیے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ سید نذیر نیازی کا خط ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہو لاہور آیئے، علامہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس خط کے تیسرے روز علامہ کی وفات ہوگئی۔ (بحوالہ اقبال ریویو، نومبر ۲۰۰۹ء)

اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں سرسید کی عقلیت کی تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں غیر موثر ہوتی جارہی تھی۔ اگرچہ تقلید محض کے دائرہ سے نکل کر اسلام کی فکری توانائیوں کو قرآن حکیم سے اخذ کرنے اور مغرب کے فکری غلبہ سے دنیائے اسلام کے نوجوان ذہنوں کو نجات دلانے کے لیے ابھی کچھ اور قدم آگے بڑھانے کی ضرورت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ نوجوان ذہنوں میں خوداعتمادی اور حرکت وعمل کی چنگاریاں پیدا کردی تھیں مگر مولانا آزاد مغرب کی فکر وفلسفہ کی گہرائیوں میں اتر کر اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ عالم اسلام میں علامہ رشید رضا، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ وغیرہ نے جدید ذہن کو بیدار کیا اور اسلامی

سرچشموں سے فیضیاب ہونے کی راہیں ہموار کیں۔ ان لوگوں نے قرآن کو رہنما بنایا اور وحی الٰہی پر اپنے افکار و خیالات کی بنیاد رکھی لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں اقبال جیسا مفکر دنیائے اسلام کو مشیت نے عطا کیا جو اس عہد کے متکلمین اور فقہاء میں امتیازی مقام کا حامل ہے۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے الفاظ میں ہر تہذیب کی فکری بنیاد فلسفہ پر استوار ہوتی ہے جس کے سہارے وہ سیاسی، ثقافتی، عمرانی، تعلیمی اور معاشی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ تہذیبی زوال آمادگی کا مرض اس وقت لاحق ہوتا ہے جب ان کا انداز فکر و نظر اور علم و عمل عصری تقاضوں کی پروا نہیں کرتا۔ کسی تہذیب پر بیتنے والا یہ لمحہ بے حد نازک ہوتا ہے۔ (موضوعات فکر اقبال، اقبال اکیڈمی، پاکستان، ص ۹)

اقبال جس عہد میں پیدا ہوئے، برصغیر کے مسلمان عوام ذہنی طور پر پس ماندہ اور فکری سطح پر احساس محرومی کا شکار تھے، مایوسی کی کیفیت ان پر طاری تھی، پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور خلافت کے زوال سے وہ اور پژمردہ تھے۔ خود اعتمادی سے محروم تھے اور ماضی پرستی کا شکار تھے۔ علامہ اقبال کو احساس تھا کہ ''اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت پہلے کبھی نہ آیا تھا''۔ (بحوالہ روزگار فقیر، فقیر وحیدالدین) چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو ذہنی و فکری پس ماندگی سے نجات دلانے کی خاطر ''اسلام کی فکری و ثقافتی ہیئت کی تشکیل جدید'' کو موضوع بنایا۔ ۱۹۲۶ء میں سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھا:

> ''مسلمانوں پر اس وقت روحانی اعتبار سے وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت رہنما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں''۔ (اقبال نامہ)

اقبال کو مسلسل یہ فکر دامن گیر تھی کہ آخر کس طرح عصر جدید کے تقاضوں اور چیلنجز کا مسلمان سامنا کریں، صوفی غلام مصطفی تبسم کو لکھتے ہیں:

> ''افسوس ہے زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانے کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ مذہب اسلام اس وقت زمانہ کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے''۔

چنانچہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے موضوع پر اقبال مسلسل سوچتے رہے اور اس کے لیے منصوبے بناتے رہے۔ وہ اس تشکیل جدید کے عمل میں اسلامی مشرقی روایات کا کوئی حصہ ترک کرنے پر تیار نہ تھے اور مغربی افکار کو بھی تمام تر رد کر دینے کے قائل نہ تھے جیسا کہ اپنے خطبات میں انہوں نے مشرق کے فکری اثاثہ کو انہوں نے بڑے فخر سے پیش کیا اور مغرب کے سائنسی رویہ اور محسوسات سے گہرا رابطہ قائم رکھنے کے طرز عمل کی تحسین کی۔ اقبال کے نزدیک یہ رویہ خود مسلمانوں کی میراث ہے۔ اقبال کی خوبی یہ تھی کہ وہ مغرب سے قطعاً مرعوب نہیں تھے اور اس کے سائنسی طرز فکر کی قدر کرنے کے باوجود اسلامی اقدار کی رفعت اور مشرق کی اس پہلو سے مغرب پر برتری کا کھل کر اظہار کرتے رہے۔

اقبال اسلام کو عصر رواں میں بھی ایک زندہ قوت تسلیم کرتے تھے۔ وہ اگرچہ بے روح قدامت پرستی کے سخت خلاف تھے لیکن ان کی تنقید سرسید کی طرح ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ نہ تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء کی مسلم کانفرنس میں ارشاد فرمایا:

> ''مگر آپ کے مذہب کا یہ اعلیٰ تخیل مولویوں اور فقہ پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے۔ یہ بات بوڑھی نسل کے لیے باعث شرم ہے کہ ہم نوجوان نسل کو اقتصادی، سیاسی نیم مذہبی خطرناک مواقع کے لیے جو موجودہ دور اپنے ہمراہ لا رہا ہے مسلح کرنے سے قاصر رہے ہیں''۔
>
> (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۱)

اقبال اسلام کو ایک سراپا حرکت دین سمجھتے تھے۔ یہ حیات و کائنات کی ماہیت کے عرفان پر زور دیتا ہے اور ان کے مطابق زندگی کے میلان و رجحان کا نام ہے۔ اسے جمود و تعطل سے سخت نفرت ہے۔ اقبال کو یقین تھا کہ اسلامی فکر اب انقلاب و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہے اور اسے کوئی قوت دبا نہیں سکتی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں یہ خیال ظاہر کیا ''اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر بھی اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا''۔ (حرف اقبال بحوالہ موضوعات فکر اقبال، ص ۱۲)

اقبال قسطنطنیہ کے شعبہ دینیات کے سربراہ کو مشورہ دیتے ہیں:

''ادارہ دینیات پر کسی ایسے شخص کو پروفیسر متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر وتصورات کا مطالعہ کیا ہوتا کہ وہ مسلم دینیات کو افکار جدید کا ہم پایہ بنا سکے۔ قدیم اسلامی دینیات کا تار و پود بکھر چکا ہے جس کا مدار زیادہ تر یونانی حکمت پر تھا۔ وقت آچکا ہے کہ اس کی نئی شیرازہ بندی کی جائے''۔ اقبال نامہ، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۵ء)

اقبال اسلامی فکر کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کس قدر مضطرب تھے اور ان کے سامنے کیا ترجیحات تھیں اس کا بخوبی اظہار ان کے خطبات مدراس سے ہوتا ہے جو اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان خطبات کے مقدمہ میں اقبال نے اپنی فکر کا نچوڑ پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے اسلام کی روایات فکر علی ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسان کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مطالبہ غلط نہیں کہ مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے، یہ وقت اس طرح کے کسی کام کے لیے بے حد مساعد ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو سر دست ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور وفکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکر انسانی کی نشو ونما پر بہ احتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد وتنقید سے کام لیتے رہیں''۔

میر غلام بھیک نیرنگ کو خطبات کے اردو ترجمے کے سلسلہ میں جو مشکلات درپیش تھیں اس کے تناظر میں لکھتے ہیں:

''ان خطبات کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا

جائے اور اگر پرانے تخیلات ہی میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیر ہی ہے اور اس تعمیر میں فلسفہ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے''۔ (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، پروفیسر سمیع اللہ قریشی، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۴)

اقبال نے اپنے خطبات میں بڑے حیات افروز تصورات پیش کیے ہیں۔ ان کے نزدیک حیات ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کی خارجی و داخلی سمتوں کو متصل کرتا ہے۔ عالم موجودات میں ہر چیز متحرک ہے اور زندگی میں یقین محکم کے بغیر کسی مثبت عمل کی توقع عبث ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کامل کی خودی بقائے دوام حاصل کرتی ہے، مادے کو اقبال نے ایک ایسی روح قرار دیا ہے جو زماں و مکاں میں محصور ہے۔ درحقیقت یہی روح وحدت انسانی ہے جو نصب العین کی تلاش میں سرگرم عمل ہے اور اسی نصب العین کو زماں و مکاں میں متشکل کرنے کی آرزو دراصل قیام مملکت کا دوسرا نام ہے۔ (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، پروفیسر سمیع اللہ قریشی، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۶)

اسلامی ثقافت کے بارے میں اقبال بڑی فکر انگیز بات کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی ثقافت کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشاہدات کے لیے زاویہ نظر بدلتے ہی تصورات کو نیا مفہوم مل جائے۔ کیونکہ اسلام بذات خود تحریک ہے جو ہر دور کے تغیرات کو اپنے اندر جذب کر کے تجربہ اور روایت کو نئے سرے سے منظّم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن محض عقیدہ کے بجائے عمل یعنی تجربہ پر زور دیتا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک اسلام ایک تہذیبی قوت رہا مسلمان دنیا پر چھائے رہے، جوں ہی مذہب عقائد و رسوم کا ایک انبار بنا اشاعت اسلام اور اسلام کے تہذیبی افق کی وسعت کا عمل رک گیا۔ (موضوعات اقبال، ص ۱۱)

اقبال اپنے خطبات اور دیگر تحریروں میں جگہ جگہ قرآن حکیم سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات میں یہ کوشش کی کہ قرآن کے اس دعویٰ کو کہ وہ ایک مربوط جامع اور متحرک نقطہ نظر ہے ثابت کیا جائے۔ اقبال نے ثابت کیا کہ قرآن ایمان و تعقل کے درمیان کسی تفریق کا قائل نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک مذہب اور سائنس کی منزل مقصود ایک ہے۔ اقبال ایک فلسفی تھے لیکن انہوں نے فلسفہ کو دین اور انسانی زندگی کے عملی مراحل سے ہم آہنگ بنا دیا اور خود فلسفہ پر اپنی اس تنقید کی اپنی تحریروں سے تردید کی۔

ہے فلسفہ زندگی سے دوری ایام خرد سے بے حضوری

انہوں نے ثابت کیا کہ ایک فلسفی دین کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے دین کے افکار کی تشکیل وترتیب نو میں حصہ لے کر اس کی آب وتاب بڑھا سکتا ہے۔اس کے لیے وہ صرف عقل پر بھروسہ کرنے کے بجائے وحی و الہام کی روشنی کا قدم آگے بڑھاتے ہیں ۔ بقول پروفیسر سمیع اللہ اقبال نے یہ ثابت کیا کہ دین کے اصولوں کی وضاحت فلسفہ کے تعاون سے کی جاسکتی ہے۔

اقبال کے عہد میں قوم پرستی ووطن پرستی ایک عقیدہ بن کر مغرب کے اثرات کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں پر بھی مسلط تھی اور یہ خیال عام تھا کہ اس عہد میں انسانوں کو یہی تصور بہتر طریقہ سے مربوط کرسکتا ہے ۔کانگریس اور دیگر سیاسی واجتماعی تحریکوں کا اس پر پختہ ایمان تھا۔ عالم اسلام بھی پورے طور پر اس کی گرفت میں تھا۔اقبال نے اس تصور کی مخالفت کی ،مولانا حسین احمد مدنی کے خط کے جواب میں انہوں نے اختصار کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> ''اگر عالم انسانیت کا مقصد اقوام متحدہ کا امن وسلامتی اوران کی موجودہ ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلامی کے کوئی دوسرا نظام ذہن میں نہیں آسکتا، کیونکہ قرآن سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی ونسلی نقطہ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے''۔(روزنامہ احسان، مارچ ۱۹۲۸ء)

علامہ اقبال نے مغرب میں جنم لینے والے جذبہ قومیت و وطنیت کو ان کی مجبوری قرار دیا ہے کہ ان کے پاس کوئی عالم گیر سیاسی واخلاقی نظام موجود نہ تھا اور مسیحی دنیا کو مربوط کرنے کا یہی نسخہ ان کی سمجھ میں آیا اور انہوں نے یہ تصور کرلیا کہ سیاسی اتحاد واتفاق کا وجود عقیدہ وطنیت کے تحت ہی ممکن ہے۔علامہ نے اس باطل نظریہ پر اپنے ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ صدارت میں کھل کر تنقید کی ہے اور اپنی متعدد نظموں میں وطنیت وقومیت پر نشتر چلایا ہے ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر
اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال نے اپنے فکری نظام میں فلسفہ کے ساتھ سائنس کو خصوصی توجہ کا محور بنایا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں سائنس کے منہاج غور و فکر کا مطالعہ کیا۔ بقول پروفیسر سمیع اللہ ''موحد ہونے کی بنیاد پر انہوں نے مادہ، انسان، ذہن اور زندگی کے ظاہری اختلاف میں حقیقت واحدہ کو تلاش کیا۔ ہر چند کہ انسانی تہذیب کے ان تینوں اداروں مذہب، فلسفہ اور سائنس کی زبان قواعد اور طریق کار میں کافی اختلاف موجود ہے تاہم اقبال قرآن کی روشنی میں ان تینوں میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تینوں انسان کے لیے حقیقت واحدہ کی تقسیم میں ممد و معاون ٹھہرتے ہیں اور ساتھ ہی ترقی پذیر انسانی تمدن کو مختلف مراحل طے کرانے کا باعث بنتے ہیں''۔ (موضوعات فکر اقبال، ص ۸۲)

اقبال کے نزدیک سائنٹفک انداز سے کائنات اور اس کی اشیاء کا مطالعہ اسلام کی ایک خاص عنایت ہے ؎

حکمت اشیاء فرنگی زادہ نیست اصل اوجز لذت ایجاد نیست
چوں عرب اند راروما پر کشاد علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند حاملش افرنگیاں برداشتند

عمیق مشاہدہ اور تجرباتی مطالعہ کا آغاز مسلمانوں نے کیا چنانچہ رابرٹ بریفالٹ اپنی مشہور کتاب "The Making of Humanity" میں لکھتے ہیں:

''آج یورپ میں جس سائنسی ترقی کا دور دورہ ہے اس کی بنیاد عربوں نے ہی استوار کی تھی، یونانی تو تجرباتی اصول سے بالکل ناآشنا تھے''۔ (بحوالہ محمد رفیع الدین، حکمت اقبال، لاہور، ص ۲۱۷)

مشہور فرانسیسی سائنس داں سیڈیلو بھی اس کی تائید کرتا ہے:

''وہ (عرب) معلوم سے نامعلوم کی طرف آتے تھے اور کسی ایسی بات کو سچ نہ مانتے تھے جس کی تائید وتوثیق ذاتی تجربہ یا تجربہ گاہ سے نہ ہوتی۔ سائنس کے مسلمان استادوں نے ان ہی اصولوں کی تعلیم دی اور ان ہی کا دعویٰ کیا''۔

رسالہ اسلامک ریویو لندن کے مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارے میں جان ڈبلیو کیمپبل جونیر اعتراف کرتے ہیں:

''ہم نے سائنس کی میراث روما سے لی ہے نہ یونان سے بلکہ اسلام سے لی ہے''۔

اقبال بیسویں صدی میں ان نمایاں مفکرین میں ہیں جنہوں نے فکر انسانی کی نشو ونما میں آزادی کے ساتھ نقد وتنقید کا دروازہ کھلا رکھنے کی حمایت کی۔ وہ تصوف پر اس لیے معترض تھے کہ وہ غور وفکر کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ساتھ ایک گفتگو میں اقبال نے یہ تسلیم کیا:

''وہ فلسفہ اور مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کی نشو ونما کے منافی ہو بیکار چیز ہے، تصوف نے سائنٹفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ گوش وچشم کو بند کرنا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود وانحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے، خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے لیے احکام بن جائیں''۔ (ملفوظات اقبال، محمود نظامی، ص ۱۶۲)

اقبال نے کائناتی اسرار کا انکشاف ایک مسلمان کی اولین ذمہ داری قرار دی۔ مذہب و سائنس کا مستقبل ان کے نزدیک ایک سا ہے اور انہوں نے پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے الفاظ میں مذہبی تجربے کے لیے عمل کا وہی معیار مقرر کیا جو سائنسی تجربہ کے اثبات کے لیے عقل ٹھہراتی ہے۔ اقبال ہمیں مذہب کے معاملہ میں جس شعور سے آشنا کراتے ہیں وہ سائنسی حقائق کا ہی بخشندہ شعور ہے۔ (موضوعات فکر اقبال، ص ۸۵)

۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں انہوں نے فرمایا:

''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ

اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ یورپ میں علم کا پندرہویں صدی میں چرچا مسلمانوں
ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا''۔

۱۹۱۰ء میں آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں علامہ نے اپنے خطبہ بہ عنوان ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر میں مسلمانوں کے دور اول کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

''اس دن سے جب کہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا سولہویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا، اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہوسکتی تھی لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور ایک ایسا جامع و مانع نظام فقہ مدون کیا جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے گراں مایہ ترکہ ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے''۔ (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، علامہ اقبال مترجمہ مولانا ظفرعلی خاں، اقبال اکیڈمی لاہور)

اقبال اس خطبہ میں ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دیکھتے ہیں جو اسلامی فکر و نظر اور اسلامی تہذیب کو فروغ دے۔ وہ فرماتے ہیں ء

''کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے ایام گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمان کے لیے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے۔ مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بہ قدم چلنا ہے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اخلاق و مذہب کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے مبلغ کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے''۔ (ملت بیضا پر ایک نظر، ص ۲۴)

اقبال زندگی کے آخری دور میں مسلسل مسلمانوں کے مغرب کے بالمقابل اپنے پیروں

پر کھڑے ہونے اور اپنی متاع گم شدہ یعنی علم وحکمت کی بازیافت کرنے کی تمنا کا اظہار کرتے رہے اوراس کے لیے اہل علم میں ذوق طلب وشوق جستجو پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے ۱۹/ مارچ ۱۹۳۸ء کی ایک گھریلو نشست میں انہوں نے فرمایا:

''مسلمانوں کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابل فخر ہے۔ علم وحکمت کی کوئی شاخ نہیں ہے جس پر ان کی ذہانت واجتہاد کا نقش ثبت نہ ہو۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں علمی روح پیدا کی اور علوم وفنون کو ان کے اصل راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود جسے آج کل سائنس کہتے ہیں انہی کا مرہون منت ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشو ونما کا دار و مدار ہے۔ یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ، معائنہ فکر ونظر محسوس اور غیر مرئی کا احترام، تجربہ وتحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اوران کی مسلسل تاویل وتعبیر۔ یہ شرائط یوں نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رکا رہتا''۔۱۰ اقبال کے حضور میں، سید نذیر نیازی، جزء اول، کراچی، جولائی ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۴)

اقبال کو اس بات پر بے حد تشویش تھی کہ ''آج مسلمانوں میں علمی تجسس کا فقدان ہے۔ عالم اسلام کا ذہنی انحطاط حد درجہ اندوہناک ہے۔ مسلمانوں میں علمی روح باقی ہے نہ علم وحکمت سے کوئی دلی شغف۔ وہ علم وحکمت کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں نہ اس کے ماضی کے عہد بہ عہد ارتقاء انقلابات اور تغیرات کو۔ اگر کچھ ہے تو تقلید یا پھر یورپ سے چند ایک مستعار لیے ہوئے خیالات کا اعادہ''۔

اپنی زندگی کی آخری مجالس میں انہوں نے حسرت سے اپنے اس درد وکرب کا اظہار کیا:

''جس مایوسی و دل گرفتگی میں آج کل دنیا گرفتار ہے اور جس کے زیر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہد وسطیٰ کی صوفیانہ تحریک سے ہوسکتا ہے نہ جدید زمانہ کی وطنیت اور لادینی اشتراکی تحریکوں سے۔ اس وقت دنیا کو حیات نو کی ضرورت ہے۔ اگر عصر حاضر کا انسان دوبارہ وہ

اخلاقی ذمہ داری اٹھائے گا جو جدید سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت۔ صرف اسی طرح اس کے اندر ایمان و یقین کی کیفیت کا احیاء ہوگا جس کی بدولت وہ اس زندگی میں ایک انفرادیت پیدا کرتے ہوئے آگے چل کر بھی اسے محفوظ اور برقرار رکھ سکے گا''۔ (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، ص ۱۰۹)

علامہ نے اسلامی فکر و فلسفہ کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے امتیازات پر بڑی تفصیل سے اپنے خطبات میں روشنی ڈالی ہے۔ علامہ کے نزدیک ایک کامیاب زندگی کے لیے ہماری عملی کشمکش وہی رنگ اختیار کرلے گی جیسا ہمارا اخلاق اور روحانی نصب العین لیکن جس میں ہم اپنے غور و تفکر اور واردات باطن کے ساتھ واقعیت کی اس دنیا سے منہ نہیں موڑیں گے جو محسوس حقائق اور لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے واقعات و حوادث کی شکل میں ہمارے سامنے آتی اور جواباً کسی عمل پر مجبور کرتی ہے۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۶)

علامہ چاہتے تھے کہ اپنے تاریخی افکار کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے وہ روایات از سر نو قائم کریں جن کا تعلق خالصاً اسلامی فکر سے ہے۔ علامہ محسوس کرتے تھے کہ مغرب نے مسلمانوں کی تاریخ فلسفہ کو بڑے گمراہ کن انداز میں پیش کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا کوئی فکری نظام ہی نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے علم و عمل کی دنیا میں ایک بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کر دیا۔ ضرورت ہے کہ اپنے تاریخی افکار کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کریں اور وہ روایات از سر نو قائم کریں جن کا تعلق خالصاً اسلامی فکر سے ہے۔ اقبال مسلمانوں کے دور زوال میں بھی اسلامی فکر کے ارتقاء کے تسلسل کو محسوس کرتے اور اسے بیسویں صدی اور اس کے بعد بھی جاری رکھنے کے لیے نوجوان مفکرین کی تربیت کے آرزومند تھے۔ اسی اسلامی فکر کی تشکیل جدید کی فکر اور اس کے لیے اسلامی دنیا کے دانشوروں کو بیدار کرنے کی غرض سے انہوں نے اپنے مشہور خطبات مرتب کیے جو مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں پیش کیے گئے، جن میں شعور انسانی کی کامل بیداری کا پیغام پنہاں ہے۔ اقبال کے مطالعہ قرآن نے یہ حقیقت ان پر منکشف کی تھی کہ اسلام سمع، بصر، فواد و قلب کے ساتھ ساتھ بار بار فکر اور علم پر زور دیتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن غور و تفکر کا سرچشمہ ہے۔ نذیر نیازی کے الفاظ میں اقبال چاہتے تھے کہ تعلیمات قرآنی پر ہم اپنے

ذہن کو مرتکز کر کے یہ معلوم کریں کہ اسلام کا مطمح نظر عالم انسانی کے بارے میں کیا ہے وہ ہم سے کس قسم کی زندگی کا طالب ہے ۔ ہمارے اخلاقی و مادی نشو ونما کے ساتھ ساتھ حیات فرد اور استحکام جماعت کی طرح تہذیب انسانی کے حفظ وارتقاء کی اساس کن اصولوں پر رکھتا ہے، لہٰذا بحیثیت ایک جامع و ہمہ گیر تحریک کے اس کا ماضی کیا ہے، حال و مستقبل کیا ہے ہماری حیات ملی کا گذر کن کن مراحل سے ہوا، وہ کیا مشکلات تھیں جو ہمیں اپنے ثقافتی نصب العین اور مذہبی اور روحانی زندگی کے اظہار میں پیش آئیں، ہماری میراث علم وحکمت اور سرمایہ ادب کیا ہے، ہم نے تاریخ عالم کا رخ کس طرف موڑا، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم حسب سابق ان قوتوں کو پھر سے اپنے تصرف میں لائیں جو تقدیر انسانی کی صورت گر ہیں اور جس کے بغیر ہمارے اخلاق و روحانیت ہی کے کچھ معنی ہیں نہ اعمال وعقاید کے ۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مقدمہ، ص ۳۱)

اقبال اس باب میں واحد رہنمائی قرآن سے حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ قرآن کا مطالعہ بحیثیت ایک رہنما کتاب کے کریں نہ کہ پہلے سے قائم شدہ افکار وتصورات کی روشنی میں ۔ اقبال قرآن کو ایسا دستور حیات قرار دیتے ہیں جس کی تکمیل حضور اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے اس طرح ہوئی کہ صدیوں کے زوال وانحطاط کے باوجود اس کی اصل حقیقت نہ کبھی ارباب بصیرت سے چھپ سکی نہ عالم اسلام کی تاریخ ان ہستیوں سے خالی رہی جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ عملاً اس کے قیام و بقا کی سعی کرتے رہیں ۔ قرآن حکیم سے اس وقت بھی عالم انسانی کی تقدیر وابستہ ہے ۔ اقبال کو اس بات پر تشویش ہے کہ اس وقت فتنہ استشراق اور زوال علم کی وجہ سے خود مسلمان قرآن کی صحیح روح سے غافل ہو گئے ہیں اور اپنے ماضی سے بیزار اور مستقبل سے مایوس ہیں ۔ نذیر نیازی کے الفاظ میں اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب وتمدن کے تصرف واستیلا کے باعث ان خیالات سے معمور ہے جن پر علم حاضر کی انتہاء ہوئی ہے، علم وحکمت کی تاریخ یا تہذیب وتمدن کا کوئی منظّم اور مربوط بیان ہے تو وہی جو اہل مغرب پیش کرتے ہیں ۔ ہمارے پاس کچھ ہے تو چند متفرق اور منتشر حقائق، چند ادھورے اور بے ربط نظریات اور اس لیے ہمارا غور وفکر اور ہمارا ذوق تجسس بالآخر وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو دانایان فرنگ کا ہے ۔ اس لیے ہم وہ سب نتائج قبول کر لیتے ہیں جو مغربی علم و

فضل نے ہمارے ماضی کی تعبیر میں قائم کر رکھے ہیں۔

علامہ چاہتے تھے کہ ہم اس علم وفضل سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور ابداع سے کام لیں۔ ہمیں فکر مستعار اور فکر خلاق میں فرق کرنا ہوگا۔ اخذ واکتساب سے آگے بڑھ کر ماضی و حال پر نقد و تفحص سے نظر ڈالنا اور شان اجتہاد سے آگے بڑھنا ہوگا۔

علامہ کے اندر نذیر نیازی کے الفاظ میں قرآن حکیم کی تعلیمات نے وہ نظر پیدا کی جس نے ان حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے جو ہمارے شعور ذات اور علم وعمل کا نقطہ آغاز ہیں ایک ایسے فکر کی طرح ڈالی جس کی شان خلاقی اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس نے حقیقت کا ایک تصور پیش کیا ہے جو ان نقائص سے پاک ہے جو مختلف نظامات فلسفہ میں بالعموم موجود ہیں اور انہیں واقعیت سے دور کر دیتی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ علامہ مشرق ومغرب کی تاریخ فلسفہ اور تہذیب وتمدن پر پوری نظر رکھتے ہیں اور وہ اپنے نتائج فکر کو جدید زبان میں پیش کرتے ہیں۔

اقبال اپنے خطبات کے دیباچے میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ قرآن فکر کے بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔ اقبال ان صوفیہ کی خدمات کا بھی اعتراف کرتے ہیں جنہوں نے دور اول میں ''مسلمانوں میں مذہبی احوال وواردات کی تشکیل اور رہنمائی میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن آگے چل کر جو حضرات اس میدان میں تھے وہ موجودہ دنیا کے افکار وتجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اقبال کے نزدیک عصر حاضر میں کسی ایسے منہاج کی ضرورت ہے جو عضویاتی اعتبار سے شدید بدنی ریاضت کا طالب نہ ہو مگر نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن سے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے تاکہ وہ اسے بہ آسانی قبول کر لے............ یعنی مذہب کی بدولت ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے''۔ (ص ۳۵، تشکیل جدید)

غرض علامہ نے گذشتہ صدی میں مسلمانوں کی فکری دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا جو سرسید کی علی گڑھ تحریک سے کہیں زیادہ انقلاب آفریں تھا اور جس سے فکر وخیال اور عملی انقلاب کے متعدد چشمے پھوٹ پڑے، جس کا متعدد اہل قلم نے مفصل طور پر جائزہ لیا ہے۔

مولانا شبلیؒ کے فارسی خطوط

جناب ساجد صدیق نظامی

شبلی کی جامع کمالات شخصیت بھلا کس گوشۂ علم سے آشنا نہ تھی۔ سیرت وسوانح نگاری، انشاپردازی اور شاعری پر عبور کامل کے ساتھ عربی وفارسی زبان وادب کا کامل فہم، ملت اسلامیہ اور مسلمانانِ ہند کو پیش آمدہ مسائل کا ادراک اور مستقبل میں منصوبہ بندی کی ضرورت پر توجہ، صحت مند علمی رجحانات کے فروغ کا احساس۔ یہ سب وہ میدان ہائے کار ہیں جو شبلی کی طبع نادر کی جولاں گاہ تھے۔ شبلی نعمانی کے علمی کارہائے نمایاں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کی متعدد کتب آج بھی اپنے موضوع پر مستند تسلیم کی جاتی ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

> ''شبلی نے اپنے وقت کا بہترین استعمال کیا۔ ان کے عظیم کارناموں کا راز ان کی ترقی پذیری میں ہے۔ ''اسکات المعتدی'' سے ''سیرت النبیؐ'' تک علمی، ادبی اور ذہنی ارتقا کی جو منزلیں ہیں، انھیں وہی شخص طے کرسکتا تھا جسے مسلسل یہی جستجو ہو کہ 'خوب سے ہے خوب تر کہاں''۔(۱)

پھر لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کی زندگی میں سبق اور ہمت آموزی کا بڑا سامان ہے۔ خوش قسمت تھے وہ لوگ جو ان سے براہِ راست فیض یاب ہوئے، لیکن علامہ کا اصل سرمایۂ حیات صفحۂ قرطاس پر ثبت ہے، اس سے مستفید ہونے کا ہمیں بھی پورا موقع حاصل ہے''۔(۲)

شبلی کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ شبلی کی شعری صلاحیت بھی ان کی شخصیت کا ایک

لیکچرر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے طلبا، لاہور کینٹ۔

اہم رخ ہے۔شبلی نے اردو و فارسی شاعری (غزل،نظم،قصیدہ) میں ایک قابلِ لحاظ حصہ یادگار چھوڑا ہے۔شبلی کی اردو و فارسی شاعری کے مجموعے اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔علی گڑھ قیام کے دوران فارسی میں لکھے گئے قصائد اور منظومات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

شبلی کی تخلیقی شخصیت کا ایک رخ ان کی مکتوب نگاری بھی ہے۔شبلی کے مکاتیب کا ایک مجموعہ مولانا سید سلیمان ندوی نے دو حصوں میں مرتب کر کے بالترتیب ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں شائع کیا۔اس کے علاوہ محمد امین زبیری نے شبلی کے مکاتیب کا ایک مجموعہ ''خطوط شبلی'' کے نام سے بھی شائع کیا۔ان مجموعوں میں شامل مکاتیب،شبلی نعمانی کی شخصیت کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں،کئی پہلوؤں کو نمایاں کرتے اور کئی امور سے پردہ اٹھاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ مکاتیب شبلی کی تخلیقی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار رہتے ہیں۔شبلی کے خطوط سے متعلق تفصیلی اظہار خیال مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مرتبہ مجموعے کے حصہ اول کے دیباچے میں کیا ہے۔اسی دیباچے میں مہدی افادی کا مفصل تجزیہ بھی شامل ہے۔اس دیباچے کا مطالعہ شبلی کے خطوط کی افادیت ثابت کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتبہ مجموعہ مکاتیب میں شبلی کے اردو خطوط کے ساتھ ساتھ فارسی مکاتیب بھی جمع کیے گئے ہیں۔شبلی کے اردو خطوط کے ساتھ ساتھ فارسی خطوط کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔اردو خطوط کے مطالعے تو ہوتے آئے ہیں مگر فارسی خطوط کو معتد بہ توجہ نہیں مل سکی۔اس مضمون میں شبلی کے فارسی خطوط کا ہی جائزہ لیا جائے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ شبلی علی گڑھ آمد (۱۸۸۳ء) سے قبل اپنی بیشتر خط و کتابت فارسی میں کیا کرتے تھے۔مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کسب فیض کے لیے لاہور آئے تو والد سے خط کتابت فارسی میں کی۔اسی دور میں اپنے چچا،بھائی اور دوستوں کو خطوط لکھے تو فارسی میں۔اسی فارسی مکتوب نگاری کے بارے شیخ محمد اکرام کا تبصرہ یہ ہے کہ ''وہ ابھی بیس برس کے ہیں اور دس روپے کی محافظی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن خط لکھیں گے تو فارسی میں''۔(۳) شبلی کے ہاں فارسی مکتوب نگاری کا یہ سلسلہ جون ۱۸۸۴ء تک رہا ہے۔اس کے بعد فارسی کے چند خطوط ہیں مگر وہ بہت ہی کم ہیں اور صرف دو ایک اصحاب کو لکھے گئے ہیں۔ایک خط شبلی کے قیام

ندوہ کے زمانے کا ہے جو شبلی نے سر آغا خان کو لکھا تھا۔ یہ خط سے زیادہ ایک دعوت نامہ ہے جس میں طلبائے ندوہ کی تعلیمی استعداد ملاحظہ کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہے۔ اس خط نما دعوت نامے کی تحریر فارسی زبان میں اس وجہ سے ہے کہ اس دور میں اردو کے عام چلن کے باوجود طبقہ اشرافیہ کی زبان فارسی ہی تھی۔

جس دور میں شبلی علی گڑھ سے منسلک ہوئے وہ فارسی کی جگہ اردو کی عام مقبولیت کا دور تھا۔ شبلی چونکہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کے مدرستہ العلوم میں آ گئے تھے اور علی گڑھ کے اصحاب اپنا علمی سرمایہ زبان اردو ہی میں پیش کر رہے تھے۔ اس وجہ سے بھی ۱۸۸۴ء کے بعد شبلی کے فارسی خطوط بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی نے اپنی ابتدائی تعلیمی زندگی میں والد کے نام خطوط فارسی میں قلم بند کیے ہیں لیکن علی گڑھ آمد کے بعد جو خطوط اپنے والد کو لکھے وہ اردو میں ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے مرتبہ مجموعۂ مکاتیب میں فارسی کے ۲/خطوط ہیں جبکہ ۴/خطوط اردو میں ہیں جو شبلی نے اپنے والد کو لکھے ہیں۔ یہ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۲ء تک کے ہیں۔ تین خطوط قسطنطنیہ سے لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح شبلی کا ایک خط چچا کے نام فارسی میں ہے، یہ علی گڑھ آمد کے کچھ ہی عرصے بعد لکھا گیا ہے۔ جب کہ اس کے بعد چچا کے نام تمام خطوط اردو میں ہیں۔

یہی کچھ مولوی حمید الدین (۴) کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔ ان کے نام ۱۸۸۴ء تک فارسی کے صرف ۲ خط موجود ہیں۔ مگر بعد میں خط کتابت کا یہ سلسلہ اردو میں نظر آتا ہے اور یہ ۷۷ خطوط ہیں۔ صرف ایک استثناء مولوی محمد سمیع (۵) کے معاملے میں ہے۔ شبلی انھیں آخر تک فارسی اور اردو دونوں میں خط لکھتے رہے۔

درج بالا حقائق اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ علی گڑھ میں ملازمت کے دوران من جملہ دیگر اثرات کے جو شبلی پر مرتب ہوئے، ایک اثر یہ بھی ہوا کہ شبلی فارسی انشاء پردازی سے ہاتھ اٹھا کر اردو انشا پردازی کی جانب متوجہ ہوئے۔

شبلی کے یہ فارسی خطوط تعداد میں (۳۳) تینتیس ہیں۔ جن اصحاب کو یہ لکھے گئے ہیں ان کے اسماء ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ نام کے سامنے ان کے نام خطوں کی تعداد بھی درج

کردی گئی ہے۔

۱۔شیخ حبیب اللہ،(۶) والد محترم	۲خط	۲۔شیخ عجیب اللہ،(۷) چچا	ایک خط
۳۔مہدی حسن، بھائی (۸)	۳خط	۴۔حکیم محمد عمر (۹)	۳خط
۵۔مولوی حمیدالدین	۲خط	۶۔مولوی محمد عمر (۱۰)	۸خط
۷۔مولوی محمد سمیع	۱۱خط	۸۔اکبر صاحب	ایک خط
۹۔فرحت احمد	ایک خط	۱۰۔سرآغا خاں	ایک خط

ان خطوط میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ شاید شبلی نے دل لگا کر نہایت توجہ سے انھیں قلم بند کیا ہے۔شیخ محمد اکرام کے نزدیک: ''شبلی کے احتیاط قلم کی ایک خاص وجہ تھی، انھیں شروع ہی سے اپنی قابلیت اور صلاحیتوں پر اعتماد تھا''۔(۱۱)

اردو خطوط کے برعکس شبلی فارسی خطوط میں آغاز میں مکتوب الیہ کے لیے توصیفی کلمات ذرا زیادہ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔شبلی کے اردو خطوط برادرم،عزیزی،مکرمی، برادر عزیز اور تسلیم جیسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں ۔ جبکہ فارسی خطوط میں یارِ دلنواز، مایۂ نازِ ما، برادرِ اعظم صاحب، یار گرامی مدظلہ السامی ، ایسے القاب دکھائی دیتے ہیں ۔ جو خطوط والد کے نام ہیں ان میں مکرمی خدمت جناب والد ماجد، اعلیٰ حضرت کے القاب استعمال کیے ہیں ۔ چچا کو خط لکھتے ہوئے عم مکرم فیضہ ،تسلیم و نیاز اور بھائی مہدی حسن کے نام خط میں ان کے نام کی مناسبت سے آغاز میں مہدی باللہ کا لقب لکھا ہے۔اسی طرح ان ہی کے نام ایک خط کو''عزیز من مسٹر مہدی حسن انبتک اللہ نباتاً حسناً'' سے شروع کیا ہے۔

اگر اردو خطوط میں دیکھیں تو شبلی نے والد کے نام خط محض ''قبلہ ام'' سے شروع کیے ہیں اور چچا کے نام خط''جناب من'' سے شروع ہو رہے ہیں۔انھی توصیفی وتمہیدی کلمات کے فرق سے شبلی کے فارسی واردو خطوط کے اسلوب کے اولین فرق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ خطوط چونکہ زیادہ تر شبلی نعمانی کے علی گڑھ آنے سے قبل کے ہیں لہٰذا ان میں شبلی کی ابتدائی زندگی اور اس دوران پیش آمدہ مشکلات و واقعات کے اشارے بھی کثرت سے نظر آتے ہیں۔مثلاً پہلا خط اس وقت کا ہے جب شبلی نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف اصحاب

علم سے مستفید ہونے کا ارادہ کیا جب کہ ان کے والد اس بات پر راضی نہ تھے۔شبلی نے عربی کی تعلیم کے لیے مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے فیض حاصل کرنے کا سوچا اور لاہور کے لیے نکل پڑے۔مولانا فیض الحسن ان دنوں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔شبلی کی جیب میں تب پچیس روپے تھے۔دو ماہ بعد جب یہ رقم ختم ہوگئی تو شبلی نے مجبوری کے عالم میں اپنے والد کو خط لکھا:

''مکرمی خدمت جناب والد ماجد،

مرا دو ماہ می گذرد کہ ترکِ وطن کردہ ام، و بہ بیگانگان بسر بردہ ام، بیست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود، سہ روپیہ بہ کرایہ یکہ از اعظم گڑھ تا جونپور رفت و ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارن پور شد، و پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی می ماند، اول کہ در ینجا رسیدم دو یک روپیہ بحوائج ضروریہ کہ در دقت قیام جائے پیش می آید، صرف شد، وچون در ینجا جاے قیام نبود، مکانے بکرایہ یک روپیہ گرفتم، دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود، آنچہ باقی می ماند بصرف طعام آمد، اگر انصاف رود بچند ان کفایت بسر بردہ ام کہ بیش از و متصور نیست، چون مزاج عالی اند کے برہمی داشت، از تکلیف ارسال صرف باز ماندم، اکنون کار مشکل افتاد است، دیگر چہ گویم تاخیر آزارتمام باعث، خواہد بود۔

حد ادب

شبلی نعمانی ۱۲۸۹ھ''(۱۲)

شبلی کی زندگی کی اس حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے کہ:

''اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دل دادگانِ کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں''۔(۱۳)

لاہور کے اس سفر کے بعد شبلی مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے ساتھ سہارنپور چلے گئے کیونکہ مولانا تعطیلات کے باعث اپنے آبائی وطن جارہے تھے۔شبلی نے والد کے نام دوسرے خط میں اسی واقعے کا ذکر کیا ہے:

''در چند روزے مدرسہ اینجا تعطیل خواہد یافت، تعطیل تا دو ماہ خواہد ماند۔ حضرت استاذ بوطن خویش یعنی سہارن پور تشریف خواہند برد، این قدر ناغہ نتوان کرد، مرا ھم عزمِ سہارن پور است''۔ (۱۴)

اسی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے قیامِ لاہور کے دوران اپنے والد کو 'گلستان' روانہ کی تھی جو شاید انھیں موصول نہ ہو پائی۔ اس کا ذکر یوں کیا ہے:

''در قریب روزگارے عریضہ مع گلستان مطبوعۂ لندن ارسال خدمت کردہ ام، اگر نرسیدہ است از نارسائی بخت است۔ مرا در این میان جرمے نیست''۔ (۱۵)

گلستان، مطبوعہ لندن، والد کو بھجوانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان حالات میں شبلی کو والد کی تالیف خاطر مقصود ہو۔

ان ہی خطوط میں شبلی کی ابتدائی زندگی کے متعلق ایک اور اہم واقعے کا اشارہ ملتا ہے۔ شبلی فارغ التحصیل ہو کر اعظم گڑھ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ یہ ۱۸۷۷ء کا زمانہ تھا۔ ان ہی دنوں روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ چھڑ گئی تو برصغیر کے مسلمان بھی اس واقعے سے مضطرب ہوئے۔ ہندوستان میں جگہ جگہ سلطنت عثمانیہ کی حمایت میں جلسے ہوئے اور چندے اکٹھے کیے گئے۔ شبلی بھی اس فضا سے متاثر ہوئے اور اعظم گڑھ میں سلطنتِ عثمانیہ کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی۔ اس مہم میں شبلی اعظم گڑھ کی اس انجمن کے سیکرٹری مقرر کیے گئے جو یہ تمام مہم سر انجام دے رہی تھی۔ کتنا چندہ ہوا یہ شبلی کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے دوست حکیم محمد عمر کو لکھا تھا۔ خط میں لکھتے ہیں:

''چندہ این شہر تا بہ دو ہزار و شش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ ہزار بیشتر گرد آید...''۔ (۱۶)

اسی خط میں ایک ترکی سالار عثمان پاشا کی بھی از حد تعریف کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''سپاس ایزد کہ روسیان بتہ کار در روز پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند ہشت ہزار طعمۂ جحیم شدند و بیست و چہار ہزار زخمہاے گران برتن برداشتہ بربسترِ

خاک تپیدند، نسیم فتح وظفر بر پرچم علم سلطانی وزید و برادر شاہ روس گرینڈ ڈیوک نکلسن از بیم ضربت دلیران ترک از میان رمید''۔ (۱۷)

جو چندہ ترکی بھیجا گیا تھا، وہ کس کے توسط سے گیا تھا، اس کی نشاندہی شبلی کے سفرنامۂ ترکی ومصر سے ہوتی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

''حسین حبیب آفندی جو کسی زمانے میں بمبئی میں ٹرکش کانسل تھے، وہ اب قسطنطیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے کہ محاربۂ روس میں میں نے بہ حیثیت سیکرٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ قسطنطنیہ روانہ کی تھی...''۔ (۱۸)

اسی سفرنامے میں شبلی نے عثمان پاشا سے اپنی ملاقات کا ذکر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔

علی گڑھ آمد سے قبل شبلی کی دیگر مصروفیات میں سے ایک، غیر مقلد حضرات سے مناظرہ آرائی تھی۔ شبلی کے فارغ التحصیل ہونے اور علی گڑھ ملازمت اختیار کرنے کے درمیان چار پانچ برس کا وقفہ نظر آتا ہے۔ اس وقفے میں شبلی کے والد کی خواہش تھی کہ وہ یا تو وکیل بنیں یا پھر اور کوئی شغل شروع کریں اور ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے نزدیک پڑھنا پڑھانا ہی زندگی کا مطمح نظر نہیں ہونا چاہیے۔ فراغت کے اسی زمانے میں ان کی مناظرانہ طبیعت نے اظہار کے پیرائے تلاش کرنے شروع کیے۔ اس کے نتیجے میں ان کی پہلی تصنیف 'اسکات المعتدی علی انصات المقتدی' کے نام سے سامنے آئی جو دورانِ نماز امام کے پیچھے مقتدیوں کی قرآتِ سورہ فاتحہ سے متعلق تھی۔ محمد سمیع کے نام ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے چچا نے اس رسالے کی اشاعت کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا:

''از عم مکرم شیخ عجیب اللہ عجب دارم، ایشان صرف طبع اسکات المعتدی بہ ذمۂ خود گرفتہ بودند''۔ (۱۹)

یہ رسالہ ۱۲۹۸ھ بمطابق ۱۸۸۱ء میں مطبع نظامی کان پور سے شائع ہوا تھا۔

شبلی کے والد انھیں وکالت کا امتحان دلوانا چاہتے تھے اور شبلی اس پر راضی نہ تھے۔ مگر

والد کے اصرار پر انھوں نے وکالت کا امتحان دینے کی ہامی بھر لی۔ انھی دنوں اپنے دوست حکیم محمد عمر کو لکھا:

''تسلیم مکرر از من و امن التفات بر چیدہ اند کہ از پاسخ نامہ روے درہم کشیدہ اند، قسم براستی کہ نامہا فرستادہ ام، اگر نہ رسیدہ باشد مرا درمیان خطائے نیست از تطاول دہر بہ حفظ قانون مشغول ہستم''۔(۲۰)

آخری فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے لیے یہ کام کیا حیثیت رکھتا تھا۔ خصوصاً 'از تطاول دہر' کی ترکیب سب احوال واضح کرتی ہے۔

وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کی گئی اور ساتھ ہی ان کے بھائی مہدی حسن نے بھی یہ امتحان دینے کا ارادہ کیا۔ دونوں بھائیوں نے پرچے دیے۔ مگر شبلی کے دل میں یہ احساس تھا کہ پرچے صحیح نہیں دیے گئے۔ کسی ممکنہ حل کی تلاش میں وہ الہ آباد جا کر کالون صاحب کو ملے۔ کالون صاحب وکالت کے امتحان کے ممتحن تھے اور شبلی کے والد کے دوست بھی تھے۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس برس کالون صاحب ممتحن نہیں ہیں۔ افسردہ خاطری کے ساتھ مستقبل کے احوال کا اندازہ کرنے کے لیے شبلی نے ''دیوان غیب'' (دیوانِ حافظ) سے فال نکالی۔ ان سب واقعات کا تذکرہ شبلی کے اس خط میں موجود ہے جو ان دنوں انھوں نے اپنے بھائی مہدی حسن کو لکھا تھا:

''باز گلبانگ پریشان می زنم آتشے در عندلیبان می زنم
حجلۂ گل بہر من کردند و من سر بدیوارِ گلستان می زنم

المہدی باللہ

حیاک اللہ دی با کالون صاحب برخوردم، از نام ونسب پرسید، ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام پیش آمد و معذرت خواست کہ امسال صحفِ اردو نگریستن نخواہم۔ دل زدہ بہ خانہ رسیدم، و از دیوان غیب تفاول خواستم، این شعر برآمد،

آنچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم این قدر ہست کہ تغییر قضا نتوان کرد

ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پس زانوے حرمان نشستم، ہمانا درِ دل خواہی گفت کہ با این ہمہ آزادی بہ بیتے دل بستن، و کاسۂ آرزو برسر یاس شکستن یعنی چہ توان کرد کہ سر بسنگ آمد۔(۱۲)

اس امتحان میں مہدی حسن کامیاب رہے اور شبلی ناکام ہو گئے۔

اگلے برس پھر وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب رہے۔ والد کے کہنے پر اعظم گڑھ میں ہی وکالت شروع کی مگر ''اس عزم اور ارادے کے ساتھ کہ ایک حرف بھی حق وصداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا۔'' (۲۲)

کچھ عرصے بعد وکالت کو اپنے لیے ناموزوں پایا تو ان کے والد نے ان کی ملازمت کی فکر کی۔ اعظم گڑھ میں کلکٹر کی عدالت میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت ملی۔ تنخواہ دس روپے ماہانہ تھی۔ پھر قرق امین کی آسامی خالی ہوئی تو اس پر کچھ عرصہ قائم مقامی کی۔ اس ملازمت کی نوعیت یہ تھی کہ علاقے بھر میں گھوم پھر کر فرائض سرانجام دینے ہوتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران شبلی روزے کے ساتھ، گرمیوں کے دنوں میں، گھوڑے پر سوار، سختیاں جھیلتے علاقے بھر کا دورہ کرتے۔ مستزاد یہ کہ افطار وسحر کا کوئی باقاعدہ اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اس نوکری کو وکالت پر ترجیح دیتے تھے۔ انھی دنوں مولوی محمد سمیع کو لکھا ہے:

''حیاک اللہ، زندہ باشی وجان من باشی۔

غریب تر حالیست منکہ از آشفتہ سری وشوریدہ مزاجی تن بآمیزش کس نمی دادم اکنون از فرخی طالع و ہمایونی بخت کارم بخار وخس افتادہ است، مگر من و خدائے من کہ این ہمہ محنت پژوہی ونفس گدازی از آن دوست تر دارم کہ تر ہاتی چند درہم بافند ودروغ راست مانا راپیش کسان جلوہ ظہور وفروغِ قبول دہند، نفسے چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا دویعت آوردہ ایم، سزائے آنست کہ سررشتہ اش باین چنیں کار ہا بند باشد، دیگران ندانم تا درسر چہ دارند من خود درین خیال از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ بااین ہمہ خواریہا ہمان شبلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بختم یاوری کرد، ہمان خواہم بود کہ ہم ہی دود کار امانت روز از شب نشنا ختم دور راہ طلب از غایت جدوجہد تاب وتوان درباختم''۔

یہ نوکری بھی ختم ہوگئی اور اسی خط میں اس کی روداد اور وجہ بھی درج ہے:

''وہر چند کہ درین راہ پُر خطر... تاختم ودر آنجا این کار ہر کس وناکس

ساختم، مگر با این ہمہ بجائے نرسیدم و خواست و ناخواست پائے ارادت در دامن قناعت کشیدم، فرمان تقررہم بن ندادند تا بہ سند کارگذاری چہ رسید استغفر اللہ سخن از کجا تا کجا کشید، خیرہ سری از جادۂ شکیبا ئیم برکران بُرد، سخن کوتاہ مے کنم، (شبلی نعمانی، اعظم گڑھ، ۲۵/اگست ۱۸۸۲ء)''۔(۲۳)

شبلی پھر فراغت کی بسر کرنے لگے۔ چونکہ طبیعت کہیں راضی نہ ہوتی تھی لہٰذا ان کے والد نے اپنے نیل کے کاروبار سے متعلق چند ایک امور کی دیکھ بھال ان کے سپرد کی کہ بے شغل رہنے سے یہ بہتر ہے۔ شبلی نے والد کے احترام میں چار ناچار یہ امور نبٹائے، اس کا اندازہ بھی ایک خط کے ایک فقرے سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولوی محمد عمر کو ۷/اکتوبر ۱۸۸۲ء کو لکھا:

''...وچو از این کشمکش فارغ نشستم دیگر روئے داد یعنی کارم بہ گودام و متعلقاتِ او افتاد و ہر چند آن چنان کارے سزائے این ہیچکارہ نہ بود مگر مرا از انتثال امر حضرتِ قبلہ گاہی چارہ نبود...''۔(۲۴)

بالآخر ۱۸۸۳ء کے اوائل میں شبلی کو علی گڑھ میں فارسی و عربی پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ اگر چہ ایک معروف اور اس زمانے کا بلند پایہ ادارہ تھا لیکن شبلی کا دل یہاں بھی آغاز میں اپنے رتبے اور عہدے سے مطمئن نہ تھا۔ اس امر کا اظہار بھی شبلی نے اپنے چچا کے نام خط میں کیا ہے مگر یہ بے اطمینانی چند روزہ تھی بعد ازاں شبلی نے اپنی عمر کا ایک قابل قدر حصہ ادارے میں گزارا۔

ان خطوط میں شبلی کا عمدہ شعری ذوق جا بہ جا نظر آتا ہے۔ دیوان حافظ سے فال نکالنے کا بھی ذکر ہے۔ بعض خطوط کا آغاز ہی اشعار سے ہوا ہے۔ سرنامے کے یہ اشعار خط میں مندرج معاملات کے عکاس نظر آتے ہیں۔ مثلاً جس خط میں شبلی نے مہدی حسن کو وکالت کے امتحان کے بعد پیش آنے والے واقعات کا پریشان کن تذکرہ کیا ہے۔ اس خط کے بعض مندرجات اوپر درج کیے گے ہیں۔ اس خط کا آغاز ان دو اشعار سے ہوا ہے:

باز گلبانگ پریشان می زنم	آتشے در عندلیبان می زنم
حجلۂ گل بہرمن کردند و من	سر بہ دیوارِ گلستان می زنم

علی گڑھ قیام و ملازمت کے ابتدائی مہینوں میں اپنے دوست کو لکھے گئے خط (۱۷/ جنوری ۱۸۸۴ء) کا آغاز اس شعر سے کیا ہے:

در دست دیگرے است سپید و سیاہ ما ۔۔۔ با روز و شب بہ عربدہ بودن چہ احتیاج

اسی طرح ۲۴/مئی ۱۸۸۳ء کے ایک خط میں مولوی محمد سمیع کو اپنی وطن واپسی کی اطلاع دی ہے اور خط کے آغاز میں یہ شعر لکھا ہے:

شبلی خستہ ز غربت بوطن می آید ۔۔۔ یا مگر مرغِ چمن سوئے چمن می آید

اس کے علاوہ مکاتیب میں کہیں کہیں موضوعِ مکتوب سے متعلق برجستہ مصرعے اور اشعار بھی درج ہیں۔ ۵/نومبر ۱۸۸۲ء کے خط میں اپنی بے کاری اور من پسند ملازمت میسر نہ آنے پر مولوی محمد عمر کے نام خط میں یہ شعر لکھا ہے:

اکنون این شعر بر زبانِ حال دارد

از ہجومِ چغد در ویرانۂ ما جا نماند ۔۔۔ آن قدر آباد شد آخر کہ ما می خواستم

علی گڑھ ملازمت اختیار کرنے سے قبل مختلف اشغال و مصروفیات کے ساتھ ساتھ شبلی اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان دنوں میں شبلی کی طبیعت کے اس رخ کا اندازہ بھی بعض جگہ ان مکاتیب میں ہوتا ہے۔ حکیم محمد عمر کے نام ایک خط میں شبلی نے اپنی ایک پوری اردو غزل درج کی ہے اور ایک اور غزل کا شعر بھی لکھا ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں مگر خط کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۷۷ء کا ہے کیونکہ اس خط میں سلطنت عثمانیہ اور روس کی جنگ کا ذکر ہے۔ اس دوران شبلی نے بھی سلطنت عثمانیہ کی حمایت میں اعظم گڑھ میں چندہ اکٹھا کر کے ترکی بھیجا تھا۔ اس کا تذکرہ سطور بالا میں آچکا ہے۔

غزل اور خط کے کچھ مندرجات یوں ہیں:

چندروز یست کہ دراینجا طرح مشاعرہ نہادہ بودند، غزلے کہ گفتہ آمد این است۔

ناتوان عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو ۔۔۔ غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو

دردِ فرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو ۔۔۔ خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو

جوشِ وحشت میں ہو کیا ہم کو بھلا کیا فکر لباس ۔۔۔ بس کفایت ہے جنون دامن صحرا ہم کو

رہبری کی دہن یار کے جانب خط نے خضر نے چشمۂ حیوان یہ دکھایا ہم کو
دل گرا اس کی زنخدان میں فریب خط سے چاہ خس پوش تھا اے ... نہ سوجھا ہم کو
واہ کاہیدگیِ جسم بھی کیا کام آئی بزم میں تھے، پہ رقیبون نے نہ دیکھا ہم کو
قالب جسم میں جان آ گئی گویا شبلی معجزہ فکر نے اپنی یہ دکھایا ہم کو

غزلے دیگر ہم گفتہ آمد، مگر این نامہ مختصر جائے آن ندارد، یک شعر از دانیست این نمط گفتہ آمد۔

یوں چشم تر میں قامت جاناں ہے جلوہ گر جس طرح سے کہ سرو لب آب جو رہے
''شبلی''(۲۵)

۲۰/مئی ۱۸۸۳ء کو مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

''۲۴/مئی ۱۸۸۳ء از اینجانب رخت سفر می بندم واگر خواستہ خدائیست تا ۲۷/بہ عزیزان وطن می پیوندم در لکھنو ...

اور ینجا طرح مشاعرہ انداختہ اند، بہ تقاضائے احباب غزلے گفتہ آمد کہ باخویشتن خواہم آورد...''۔(۲۶)

۱۷/جنوری ۱۸۸۴ء کو مولوی حمید الدین کو اطلاع دی ہے کہ:

''...درین نزدیکی بیتے چند برروش بحر طویل از زبان خاکہ بردن جست آئینہ راز است پارہ از ان می نویستم''۔(۲۷)

شعر گوئی کے ساتھ ساتھ شبلی کے ذوق تاریخ گوئی کا ایک اشارہ انھی خطوط میں ملفوف ہے۔۱۰/اکتوبر ۱۸۸۳ء کو اپنے دوست مولوی محمد عمر کے نام خط میں اپنے ایک دوست قاضی محمد سلیم کی عیادت پر جانے اور ان کی وفات کا تذکرہ ہے۔خط کے آخر میں بہ صنعت تعمیہ تاریخ کہی گئی ہے:

چون خواستم ز پیر خرد سال مرگ او از روئے درد گفت کہ قاضی سلیم مرد(۲۸)
۴ + ۱۲۹۵=۱۲۹۹ھ

حواشی

(۱) یادگارِ شبلی: شیخ محمد اکرام، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۴ء، طبع دوم، ص ۴۵۵۔ (۲) ایضاً، ص ۴۵۶۔

(۳) ایضاً، ص ۳۳۵۔ (۴) مولوی حمید الدین فراہی (۱۸۶۳ء۔۱۹۳۰ء)۔ شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے شاگرد، مولانا شبلی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد مدرستہ الاسلام کراچی میں عربی کے استاد ہوئے۔ بعدازاں علی گڑھ کالج اور حیدر کالج الہ آباد میں بھی یہی امور سرانجام دیے۔ آخری بڑی ذمہ داری اورینٹل کالج دارالعلوم حیدرآباد دکن کی پرنسپل شپ تھی۔ شبلی ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں: اگر دارالمصنّفین قائم ہوا تو تمھارے سوا اس کا انتظام و انصرام کون چلا سکتا ہے۔ (مکاتیب شبلی، جلد دوم)۔ (۵) مولوی محمد سمیع بھی شبلی کے عزیز اور شاگرد تھے۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ''مولانا سے ان کو نہایت محبت تھی بلکہ عشق تھا۔'' (مکاتیب شبلی، حصہ اول؛ مرتبہ: سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۶۶ء، ص ۵۰)۔ (۶) شبلی کے والد حبیب اللہ اعظم گڑھ کی نامور شخصیت تھے۔ وکیل رہے اور کاروبار بھی کرتے تھے۔ فارسی شاعری کا عمدہ ذوق تھا جس کی ایک مثال شبلی نے ''شعر العجم'' میں بیان کی ہے۔ (بحوالہ حیاتِ شبلی؛ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۴۳ء، (قیاساً)، ص ۶۲)۔ (۷) شیخ عجیب اللہ، شبلی کے چچا تھے اور فارسی کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ (۸) مہدی حسن، شبلی کے چھوٹے بھائی تھے۔ بی-اے اور بیرسٹری کی تعلیم انگلستان سے حاصل کی تھی۔ بعدازاں چند سال منصف رہے۔ ۲۹/ جون ۱۸۹۷ء کو جواں عمری میں انتقال کیا۔ (۹) حکیم محمد عمر، شبلی کے ہم تعلیم و ہم صحبت تھے۔ اعظم گڑھ ہی میں ملازم رہے اور یہیں مطب بھی کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے نام شبلی کا ایک اردو خط ان توصیفی کلمات کے ساتھ شروع ہوتا ہے: برادر مکرم ما، فخر ما، مقتدائے ما۔ اسی سے ان کی قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۱۰) مولوی محمد عمر، یہ شبلی کے شاگردوں میں تھے۔ سرائے میر، اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ (۱۱) یادگارِ شبلی؛ ص ۳۳۴۔ (۱۲) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۳۶۔ اس خط کے اختتام پر معلوم نہیں کیوں ۱۲۸۹ھ کا سنہ درج ہے حالانکہ جب شبلی مولانا فیض الحسن سے پڑھنے لاہور آئے تو یہ ۱۲۹۱ھ کا زمانہ تھا۔ (۱۳) حیات شبلی؛ ص ۸۱۔ (۱۴) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۳۷۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) ایضاً، ص ۲۴۱۔ (۱۷) ایضاً، ص ۴۲-۲۴۱۔ (۱۸) سفرنامہ۔ (۱۹) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۵۵۔ (۲۰) ایضاً، ص ۲۴۳۔ (۲۱) ایضاً، ص ۲۳۹۔ (۲۲) حیات شبلی؛ ص ۱۱۴۔ (۲۳) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۵۱۔ (۲۴) ایضاً، ص ۲۴۷۔ (۲۵) ایضاً، ص ۲۴۲۔ اس خط میں شبلی کی درج کردہ یہ اردو غزل 'کلیات شبلی' (اردو) مرتبہ سید سلیمان ندوی میں شامل نہیں ہے۔ (۲۶) ایضاً، ص ۲۵۷۔ (۲۷) ایضاً، ص ۲۴۵۔ (۲۸) ایضاً، ص ۲۴۷۔

قاضی محبّ اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ)

جناب طلحہ نعمت ندوی

اسلامی ہند کے آسمان پر جو ستارے اور سیارے روشن ہوئے ان میں قاضی محبّ اللہ بہاری کی شخصیت اپنی تابنا کی کی وجہ سے ممتاز ونمایاں ہے۔ مگر افسوس کہ اس نابغۂ روزگار کی کتاب زندگی کے صرف چند ورق علامہ آزاد بلگرامی کی بدولت ہمارے سفینۂ علم میں محفوظ ہیں۔ علامہ آزاد کی دو کتابیں عربی میں سبحۃ المرجان اور فارسی میں مآثر الکرام کے دو دو صفحے قاضی صاحب کے سوانح زندگی کے نامکمل ماخذ ہیں۔ ان میں بھی بعض جزوی اختلافات کے سوا دونوں مضامین یکساں ہیں۔ لیکن بعد میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان دونوں کتابوں ہی کی مدد سے لکھا گیا۔ ذیل میں تلاش وتحقیق کے بعد قاضی صاحب کے سوانح زندگی مرتب کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

ولادت: قاضی صاحب کے سوانح نگار قاضی صاحب کی تاریخ پیدائش کے ذکر سے خاموش ہیں البتہ ان کی جائے پیدائش علامہ آزاد کی تصریح کے مطابق موضع کڑا ہے۔ جناب قیام الدین نظامی فردوسی نے اپنی تصنیف ''شرفاء کی نگری'' میں قاضی صاحب کی زندگی کے بعض نئے گوشے اجاگر کیے ہیں۔ جس میں انہوں نے ان کی عمر چوالیس سال ذکر کی ہے۔ لیکن انہوں نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ ممکن ہے کہ قاضی صاحب کے بعض اہل خاندان جو پاکستان میں موجود ہیں ان کے پاس کوئی خاندانی ریکارڈ موجود ہو۔ قاضی صاحب کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحب کا سال پیدائش ۱۰۷۵ھ ہوگا۔

علامہ آزاد قاضی صاحب کی جائے پیدائش کے متعلق لکھتے ہیں:

المعہد العالی للدراسات الشرعیہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

مسقط راس القاضی موضع کرا من توابع محب علی بور وھی معمورۃ من مضافات بھار ۔(۱)

قاضی صاحب کا مولد موضع کڑا علاقہ محبّ علی پور ہے جوشہر بہار(شریف) کے مضافات ہے۔

یہاں بہار سے مراد موجودہ بہار شریف ہے جو کبھی پورے صوبہ کا دارالحکومت اور تاریخی مقام رہا ہے۔ اسی سے چند میل کے فاصلہ پر مشہور تاریخی نالندہ یونیورسٹی کے کھنڈرات سے متصل ایک گاؤں کڑا ہے۔ جسے قاضی صاحب کے مرز بوم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آج سے چارسوسال قبل اس جگہ کی تمدنی حیثیت کیا تھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن آج یہ ایک قریہ کی حیثیت رکھتا ہے جہاں مسلمانوں کی معتد بہ آبادی ہے۔ یہ بھی انقلاب روزگار کا کرشمہ ہے کہ قاضی صاحب کا وطن آج باقی ہے لیکن علامہ آزاد نے جس علاقہ (محبّ علی پور) کا اسے تابع بتایا ہے ان اطراف میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

خاندان: آزاد نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب کے خاندان کا لقب ملک ہے ممکن ہے کہ یہ اس دیار کے اس معروف خاندان کی طرف اشارہ ہو جس کی نسبت عام طور سے فاتح بہار شریف سید ابراہیم ملک بیا کی طرف کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سید ابراہیم نے ایک نومسلم خاتون سے شادی کی تھی، اس خاتون کو پہلے شوہر سے ایک بیٹا تھا جس کی نشو ونما حضرت ملک بیا ہی کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ لوگوں نے اسے ملک کا خطاب دیا پھر اسی لقب سے اس کا خاندان مشہور ہوا لیکن بعض محققین کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ سید جواد حسن گیاوی نے اپنی کتاب ''تاریخ حسن'' میں لکھا ہے کہ ملک بیا مجرد تھے، فتح کے بعد انہیں دو باندیاں ہاتھ آئی تھیں جن میں ایک حاملہ تھی اسی کے لڑکے کو ملک کا نام دیا گیا۔(۲)

قاضی صاحب نے خود اپنے ایک رسالہ میں اپنے نام کے ساتھ صدیقی اور عثمانی لکھا ہے۔ یہ رسالہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جو مولف نزہۃ الخواطر کی نظر سے گذر چکا ہے اور شاید انہیں کا عطا کردہ ہے۔ اسی لیے انہوں نے قاضی کے تذکرہ میں ''العثمانی الصدیقی'' کا اضافہ کیا ہے(۳) اور اس کتاب کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس جناب قیام الدین فردوسی صاحب نے قاضی صاحب کی نسبت سادات سے ثابت کی ہے۔

وہ ان مختلف اقوال کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''حضرت مولانا قاضی محبّ اللہ نسبی طور پر نہ تو عثمانی تھے نہ صدیقی اور ملک برادری سے تو ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ وہ صحیح النسب سادات کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ والدہ، دادی یا نانی کی طرف سے عثمانی یا صدیقی ہوں''۔ انھوں نے تذکرہ مسلم شعرائے بہار تصنیف جناب مولانا احمد اللہ ندوی کے حوالہ سے پٹنہ کے بعض سادات خاندانوں کا جدامجد قاضی صاحب کو بتایا ہے۔(۴)

اساتذہ اور تعلیم: آزاد کی تصریح کے مطابق قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ پھر مختلف مقامات کا سفر کیا اور اخیر میں ملا قطب الدین شمس آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل کی۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

اخذ اوائل الکتب الدراسیة من مواضع شتی ثم انقطع برمتها الی حوزة المولوی قطب الدین الشمس آبادی و بدلالة هذا القطب قطع مسافة الاغتراب وانتهی الی اقصی حدود الاکتساب ۔(۵)	ابتدائی کتابیں مختلف جگہوں پر پڑھیں، پھر مولوی قطب الدین شمس آبادی سے پوری طرح وابستہ ہوگئے اور اسی قطب وقت کی رہنمائی میں علم وفن کے منازل طے کرتے ہوئے بلندی و رفعت کی چوٹی پر پہنچے۔

قاضی صاحب ملا قطب الدین شمس آبادی کے شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن ملا عبدالحلیم نے شرح سلم ملاحسن کے حاشیہ میں اور شاید انہیں کی تقلید میں صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی قاضی صاحب کے ملا قطب الدین سہالوی سے بھی تلمذ کا ذکر کیا ہے لیکن ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے قاضی صاحب کے بارے میں اپنے ایک قلمی بیاض میں لکھا ہے ''**یقال هو تلمیذ جدی بل هو تلمیذ جد جدی**''۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ملا قطب الدین سہالوی کے شاگرد نہیں بلکہ بالواسطہ شاگرد ہیں۔

تکمیل علم کے بعد قاضی صاحب نے حیدرآباد کا رخ کیا اور اورنگ زیب کے دربار میں پہنچے۔ دربار شاہی سے آپ کو لکھنؤ کے قضاء کا منصب عطا ہوا۔ جناب اسحاق بھٹی صاحب لکھتے ہیں:

''تحصیل علم کے بعد حکومت کے ایوانوں سے وابستہ ہونے کا عزم کیا

اورشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں پہنچے جو اس زمانہ میں دکن میں مقیم تھا۔ علماء کے اس قدرداں بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہوکر لکھنؤ کے منصب قضاء پر متمکن کیا''۔(۶)

قاضی صاحب جس زمانہ میں لکھنؤ کے منصب قضاء پر فائز تھے، اسی دور میں ان کے استاذ بھائی حافظ امان اللہ بنارسی لکھنؤ کے امور مذہبی کے صدر الصدور تھے۔ چنانچہ معاصرت کی بناپر دونوں میں کبھی کبھی دوستانہ مناظرے بھی ہوتے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''سلم و مسلم کے مصنف ملا محبّ اللہ بہاری اور حافظ صاحب دونوں ہم عصر تھے اور اتفاق سے لکھنؤ میں جمع ہوگئے تھے۔ ملا صاحب سلطان عالم گیر کے زمانہ میں وہاں کے قاضی اور حافظ صاحب صدر امور مذہبی تھے۔ ان دونوں میں باہم علمی صحبتیں اور دوستانہ مناظرے ہوتے رہتے''۔(۷)

سید صاحب نے مناظرہ کی جو نوعیت ذکر کی ہے وہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ آزاد بلگرامی کی عبارت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وکانا یجتمعان وتجری بینهما مباحث علمیة ۔(۸)	دونوں جمع ہوتے اور ان کے درمیان علمی بحثیں ہوتیں۔

مولانا عبدالحیؒ صاحب کی عبارت اور واضح ہے:

فجرت بینهما من المباحثات و المطارحات ما نعم بطون الصفحات ۔(۹)	ان کے درمیان جو بحثیں اور مناظرے ہوئے وہ کئی صفحات میں آسکتے ہیں۔

لیکن مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اس مناظرے کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس طرح ہے کہ لکھنؤ میں تقرری کے بعد دونوں میں بحث و مباحثہ اور علمی مناقشہ کا دروازہ کھل گیا اور لکھنؤ علمی مباحثہ کا اکھاڑہ بن گیا۔ آگے لکھتے ہیں ''دونوں سے رسالہ بازی ہوئی''۔(۱۰) اور یہ بھی کہ ''لکھنؤ کی صدارت اور قضاء سے دونوں حضرات جلد ہی الگ ہوگئے، مگر مباحثہ کی سرگرمی اس کے بعد بھی جاری رہی اور تصانیف میں ردوقدح کا سلسلہ چلتا رہا۔ قاضی محبّ اللہ نے اپنی

بعض کتابوں میں "قال الفاضل البنارسی" سے حافظ صاحب ہی کو مراد لیا ہے (۱۱)۔ چنانچہ اس کے بعد قاضی صاحب حیدرآباد کے منصب قضاء پر فائز ہوئے۔

اسی دوران قاضی صاحب بادشاہ کے عتاب کا شکار ہوئے اور منصب قضاء سے معزول کر دیے گئے (۱۲)۔ قاضی صاحب کے سوانح نگاروں نے اس کا کوئی سبب ذکر نہیں کیا ہے لیکن اس کا تجزیہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں کیا ہے۔ مولانا قاضی صاحب کی اولوالعزمیوں اور مقبولیت عام کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں "لیکن بظاہر اسی چیز نے ملا محبّ اللہ مرحوم کو محسود اقران بنا دیا تھا۔ یوں تو اپنے زمانہ میں دنیاوی حیثیت سے ترقی کے اس آخری نقطہ پر پہنچ کر رہے جو ملا گیری کرنے والوں کی معراج تھا۔ یعنی شاہ عالم بن اورنگ زیب نے برسر حکومت ہونے کے بعد ان کو بقول مولانا آزاد "صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان" کے عہدہ پر فائز کیا جو ہندوستان میں شیخ الاسلامی کے عہد کے مرادف تھا............ بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے اسی چیز نے ملا کو محسود اقران بنا دیا تھا" (۱۳) یوں تو مولانا گیلانی نے اس ضمن میں قاضی صاحب کی طرف جعلی عبارتیں اور خود ساختہ کتاب منسوب کر کے بدنام کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ بادشاہ کے دربار میں بھی ان کی شکایت پہنچا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

بہرحال سفارشوں کے بعد جب بادشاہ کا غصہ فرو ہوا اور اورنگ زیب کو اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی اتالیق کی ضرورت پیش آئی تو نظر انتخاب قاضی صاحب ہی پر پڑی اور قاضی صاحب کو معلّمی کا عہدہ تفویض کیا گیا اور اس طرح قاضی صاحب کو تدریسی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ پھر جب شاہزادہ شاہ عالم کو کابل کی حکومت سپرد ہوئی تو شاہ عالم نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے فرزند کے اتالیق کو بھی رفیق سفر بنالیا۔ اس طرح قاضی صاحب کی زندگی کے آخری ایام کابل میں گذرے۔ عالم گیر کی وفات کے بعد جب شاہ عالم نے کابل سے دہلی کا رخ کیا تو قاضی صاحب بھی اس کے ساتھ واپس تشریف لائے (۱۴) اس وقت قاضی صاحب کا ستارہ اقبال اپنے عروج پر پہنچا اور صدارت ممالک متحدہ ہندوستان کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔ علامہ آزاد لکھتے ہیں:

اختر قاضی عروج عظیم کرد، و بہ مرحمت منصبی بلند و صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان و خطاب ''فاضل خاں'' سرمایہ مباہات بدست آورد۔ اما عمر وفانہ کرد، شاہ عالم بہ اکبرآباد رسیدہ بود کہ قاضی از منصب حیات معزول گشت۔ (۱۵)

قاضی صاحب کا ستارہ اقبال بلندی پر پہنچا۔ صدارت متحدہ ہندوستان کے عظیم منصب پر فائز ہوئے۔ فاضل خاں کا خطاب ملا اور سرمایہ مباہات حاصل ہوا لیکن عمر نے وفا نہ کی، شاہ عالم اکبرآباد پہنچا تھا کہ قاضی صاحب نے وفات پائی۔

سال وفات اور اکبرآباد پہنچنے کا واقعہ مآثر الکرام میں سبحۃ المرجان پر اضافہ ہے۔ علامہ آزاد نے شاہ عالم کے اکبرآباد پہنچنے پر قاضی صاحب کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ اگر قاضی صاحب شاہ عالم کے رفیق سفر تھے تو پھر قاضی صاحب کی قبر بھی اکبرآباد ہی میں ہونی چاہیے۔ وسائل حمل ونقل کی قلت کے باوجود بہار لے جاکر دفن کرنا بعید از قیاس نظر آتا ہے، جیسا کہ رحمٰن علی نے ''تذکرہ علمائے ہند'' (۱۶) اور علاقائی مآخذ میں سید کریم الدین علوی نے اپنی تصنیف ''مخزن الانساب'' میں (جو شہر بہار شریف کے شرفاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے) قاضی صاحب کا مدفن اسی شہر کے ایک محلّہ چاند پورہ (نزد ریلوے اسٹیشن) میں شیخ فریدالدین طویلہ بخش کے احاطہ میں بتایا ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں:

نزدیک روضہ حضرت مخدوم (فریدالدین) علیہ الرحمہ ملا محبّ اللہ بہاری صاحب سلم کہ از مریدان فرزندان حضرت مخدوم علیہ الرحمہ آسودہ است۔ (۱۷)

حضرت مخدوم ہی کے قریب ملا محبّ اللہ بہاری جو کہ حضرت کے خانوادے کے مرید ہیں آسودہ خواب ہیں۔

علامہ آزاد جو قاضی صاحب کے سب سے قدیم سوانح نگار ہیں ان کے مدفن کے سلسلہ میں خاموش ہیں۔ اس عبارت سے قاضی صاحب کے تصوف وسلوک سے وابستگی اور بیعت کا بھی علم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے وطن ہی میں بیعت کی تھی۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب نے سفر کابل سے پہلے بیعت کی تھی یا واپسی کے بعد۔ اغلب یہ ہے کہ واپسی کے بعد ہی بیعت کی ہوگی اور پھر جلد ہی ان کی وفات ہوگئی اور اپنے شیخ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ لہٰذا اس

سے یہ قیاس کرنا شاید درست ہو کہ قاضی صاحب اس سے قبل وطن تشریف لے آئے تھے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ان کا قطعہ تاریخ وفات ''رفتہ سوئے ارم محبّ اللہ'' اور ''قاضی مولوی محبّ اللہ'' سے نکالا گیا ہے۔(۱۸)

معاصرین: قاضی صاحب کے معاصرین میں ملا نظام الدین بانی درس نظامی اور حافظ امان اللہ بنارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حافظ صاحب سے قاضی صاحب کی معاصرانہ چشمکوں کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ ملا نظام الدین لکھنوی سے مراسم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ملا صاحب نے قاضی کی حیات ہی میں ان کی تصنیف مسلم الثبوت کی شرح فرمائی تھی اور ایک روایت کے مطابق انہیں ارسال بھی فرمادی تھی۔ اس کی تفصیلات شروحات سلم العلوم کے تذکرہ میں آئیں گی۔

قاضی صاحب کی تصانیف: قاضی صاحب کو ان کی جن کتابوں نے شہرت جاوید بخشی ہے وہ سلم العلوم اور مسلم الثبوت ہیں۔ جو ایک مدت تک بقول علامہ شبلیؒ علماء کا سرمایہ کمال اور ان کے دستار فضیلت کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ اور بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ایک صدی تک علمائے فرنگی محل کی ذہنی جولان گاہ رہی ہیں۔ علامہ آزاد نے ان فلسفیانہ بحثوں اور قاضی صاحب کی تحقیقات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جن کا ذکر قارئین کے لیے نہ باعث دلچسپی ہوسکتا ہے نہ مفید، اس لیے انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان کی دونوں تصانیف کے حوالہ سے اصول فقہ و منطق میں قاضی صاحب کے کارناموں پر اہل علم و ارباب فضل کے تبصرے اور اقوال کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

> ''منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی، یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی، ملا محبّ اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دیے۔ یہ کتاب ملا نظام الدین نے درس میں داخل کی۔ پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں''۔

اصول فقہ کے متعلق آگے لکھتے ہیں:

> ''اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا، ملا محبّ اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا''۔(۱۹)

سلم العلوم اور اس کی شروحات: سلم العلوم قاضی صاحب کی وہ معرکہ آرا تصنیف ہے جس پر ایک مدت تک علماء کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں صرف ہوتی رہی ہیں۔ علمائے متاخرین کی معقولات کی کتابوں میں کم ایسی کتاب ہوگی جو اس قدر علماء کی توجہ کا مرکز رہی ہو اور صدیوں سے اس کی تشریح و تفصیل اور حاشیہ آرائی کی پیہم کوششیں ہوئی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایسا متن متین ہے جس نے علمی دنیا میں ہلچل مچا کر رکھ دی تھی۔ سلم کی شرح و تحشیہ سے نصف صدی قبل تک کا کوئی زمانہ خالی نہیں رہا ہے۔ ہر دور میں علماء نے اس کتاب کی خدمت کر کے اپنے فضل و کمال میں اضافہ کیا ہے۔ دراصل اس کی مقبولیت میں قاضی صاحب کی دعا کا راز مضمر ہے۔ قاضی صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ تو اس کتاب کو شمس النجوم بنا دے۔ برصغیر کے نامور محقق جناب اسحاق بھٹی صاحب نے ''تذکرہ فقہائے ہند'' میں اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر مشمولات منطق کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتی ہے۔ مصنف شہیر نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیا ہے۔ تمام منطقی اشکالات اور اس فن دقیق کے نزاعی مباحث کا احاطہ کر لیا ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمہ میں اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ سلم العلوم کتب درسیہ میں اس طرح چمکے جس طرح ستاروں میں چاند چمکتا ہے۔ ان کی زندگی میں ان کی یہ تمنا پوری ہوگئی تھی اور اہل علم نے اس کی شرح لکھنے کی طرف عنان توجہ مبذول کر لی تھی''۔ (۲۰)

کتاب کی خصوصیات و امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب مولانا عماد الدین قاسمی لکھتے ہیں ''اس کتاب کے پڑھنے سے قاضی صاحب کے بے پناہ ذہن رسا اور قوت متخیلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی عبارت مستحکم اور افکار و مسائل مدلل ہیں۔ یہ کتاب زبان و بیان کا معرکہ آرا شاہکار ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب منظر عام پر آئی اس وقت سے لے کر کسی فلسفی عالم کی لیاقت و صلاحیت جانچنے کا معیار بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے معقولیوں نے اس کتاب کے شروح و حواشی اور حواشی الحواشی لکھ کر اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ عالم اسلام کی منطقی مہارت عروج کمال کو پہنچی۔ غالباً ہند و بیرون ہند میں کوئی اس کی افادیت، معنویت اور معقولیت سے آگے نہیں بڑھ سکی''۔ (۲۱) اس کتاب کی سب سے پہلی شرح مصنف

کے معاصر اور بانی درس نظامی ملا نظام الدین کے برادرزادہ ملا احمد عبدالحق کے قلم سے منظر عام پر آئی۔ اس شرح کی تکمیل ۱۱۳۰ھ میں (مصنف کی وفات کے صرف گیارہ سال بعد) ہوئی ہے، جیسا کہ خاتمہ میں مذکور ہے۔ اس طرح شارح مصنف کے تقریباً ہم عصر ہیں۔ شارح نے اس شرح کی خصوصیات مقدمہ میں ذکر کی ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

وکنت بالغا فی الایضاح لم نجد	میں نے اس کے مطالب کی توضیح کی پوری کوشش
مثله شرحا موضحا فائقا نافعا	کی ہے۔ اتنی وضاحت کے ساتھ کوئی دوسری
للطلاب۔	شرح مجھے نظر نہیں آئی جو طلبہ کے لیے مفید ہو۔

درسی ضروریات کے پیش نظر قاضی صاحب کی دونوں تصانیف کی تشریح وتحشیہ خانوادہ فرنگی محل کا امتیاز رہا ہے اور وہاں کے ائمہ فن وارباب علم نے ہر دور میں ان دونوں کتابوں کی خدمت کو اپنا سرمایہ کمال سمجھا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر گذر چکا مسلم الثبوت کی سب سے پہلی شرح خود بانی درس نظامی کے قلم سے معرض وجود میں آئی۔ سلم العلوم کی تشریح میں اس خانوادہ کی خدمات حسب ذیل ہیں:

۱-شرح سلم العلوم از ملا احمد عبدالحق۔ ۲-شرح از ملا مبین۔ ۳-شرح از ملا حسن فرنگی محلی۔ ۴-شرح از ملا بحرالعلوم۔ ۵-حاشیہ از ملا عبدالحلیم فرنگی محلی۔

اس خاندان کے علاوہ جن ارباب کمال نے اس کو موضوع بحث بنایا ان میں قاضی مبارک گوپاموی، ملا احمد اللہ سندیلوی، قاضی احمد بن فتح محمد سندیلوی، مفتی شرف الدین رامپوری، شیخ وارث رسول نما بنارسی اور مولانا ابراہیم بلیاوی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مصر کے فاضل علامہ محمد بن علی الصبان نے بھی اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ قاضی صاحب نے سلم العلوم، مسلم الثبوت سے پہلے تصنیف کی اور اس کے ساتھ اس کی منہیات بھی لکھی، جیسا کہ سلم العلوم کی بعض عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ مسلم الثبوت میں بعض جگہ لکھتے ہیں "**وفیه نظر اثرت الیه فی السلم**"، کہیں لکھتے "**وقد فرغنا عنها فی السلم والافادات**"، مسلم الثبوت تاریخی نام ہے، جس سے سال تصنیف ۱۱۰۹ھ نکلتا ہے۔

مسلم الثبوت اور اس کی شروحات: قاضی صاحب کی دوسری معرکہ آرا تصنیف

اصول فقہ میں مسلم الثبوت ہے۔ ''حالات مصنّفین'' کے مرتب مولانا حنیف گنگوہی اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں ''مسلم الثبوت قاضی محبّ اللہ بہاری کی نہایت عالی کتاب ہے جو غالبًا علامہ ابن ہمام کی تحریر، ابن حاجب کی مختصر اور قاضی بیضاوی کی منہاج سے ماخوذ ہے۔ بہت سی جگہ فاضل موصوف نے اپنی تحقیقات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ہر فریق کے دلائل پھر شبہات و جوابات کی بھرمار، مواضع صعبہ و مباحث مشکلہ کا بہترین حل اس کے ساتھ ساتھ عمدگی عبارت و غایت اختصار وغیرہ امور اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے''۔ (۲۲)

مسلم الثبوت میں حنفی و شافعی دونوں مسالک کے اصول پر بحث کی گئی ہے۔ ملا حبیب اللہ قندھاری نے اس کتاب کو دیکھ کر اسی انداز پر ایک کتاب ''**مغتنم الحصول فی علم الاصول**'' لکھی جس میں مسلم الثبوت کے بعض مقامات کا بڑا فاضلانہ اور محققانہ محاکمہ کیا ہے۔ (۲۳)

مسلم الثبوت کے سب سے پہلے شارح مصنف کے رفیق و معاصر اور بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی ہیں۔ جنھوں نے ''الفوائد العظمٰی'' کے نام سے قاضی صاحب کی حیات ہی میں اس کی شرح تحریر فرمائی تھی۔ مصنف ''بانی درس نظامی'' مفتی رضا انصاری فرنگی محلی لکھتے ہیں ''اولین شارح (مسلم الثبوت کے) ملا نظام الدین تھے جنھوں نے ملا بہاری کی زندگی ہی میں شرح لکھی تھی اور ایک روایت کے مطابق ملا بہاری کو ارسال بھی کردی تھی۔ ملا صاحب کے پوتے ملا عبدالاعلیٰ کے مطابق ملا صاحب نے مسلم الثبوت کی دو شرحیں لکھی تھیں۔ ایک اطول، دوسری طویل لیکن شرح اطول مفقود ہوگئی ہے۔ دوسری شرح طویل تھی''۔ (۲۴)

اس کتاب کی آخری شرح ملا عبدالحق بن ملا فضل حق خیرآبادی (م ۱۳۱۸ھ) نے لکھی ہے۔ ملا عبدالحق نے قاضی صاحب کی دونوں کتابوں کی توضیح و تشریح میں حصہ لیا۔ سلم العلوم کی شرح قاضی حمداللہ اور شرح قاضی مبارک دونوں پر حواشی لکھے اور مسلم الثبوت کا بھی حاشیہ لکھا۔ ان دونوں شرحوں کے علاوہ اس کتاب کی درج ذیل شروحات لکھی گئیں۔ **کشف المبہم عما فی السلم** از علامہ محمد بشیر الدین بن محمد کریم الدین عثمانی قنوجی (م ۱۲۹۶ھ)۔ **التعلیق المنعوت شرح مسلم الثبوت** از مولانا برکت اللہ بن محمد احمد اللہ فرنگی محلی۔ **فواتح الرحموت**، یہ اس کتاب کی سب سے مشہور شرح ہے اور خانوادہ فرنگی محل کے نامور فرزند ملا عبدالعلی بحرالعلوم کے

زورِ قلم کا ثمرہ ہے۔ **مفاتیح البیوت فی حل مسلم الثبوت** ازمولانا فیض الحسن سہارن پوری (م ۱۳۰۴ھ)۔ **شرح مسلم الثبوت** ازملاحسن (تا مبادی الاحکام) شرح ملا محمد مبین فرنگی محلی۔ **نفائس الملکوت** ازمولوی ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۳۷۰ھ)۔

ان دونوں کتابوں کے علاوہ آزاد بلگرامی نے قاضی صاحب کی ایک اور کتاب "**الجوھر الفرد فی مبحث الجزء الذی لا یتجزی**" کا ذکر کیا ہے۔ پھر ان تینوں کتابوں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں "**والتصانیف الثلاثة مقبولة متداولة فی مدارس العلماء**" (۲۵)۔ (تینوں رسالے مدارس میں رائج ہیں) بعد کے سوانح نگاروں نے دیگر کتابوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جیسے "**رسالة فی المغلطات العامة الورود**" (۲۶) اور "**رسالة فی ان الحنفیة ابعد عن الرای من الشافعیة**" (۲۷)۔ کتب خانہ رضا رام پور کی فہرست مخطوطات میں **رسالة فی العلم الطبیعی** اور آزاد لائبریری علی گڑھ کے مولانا عبدالحئ لکھنوی کلکشن میں **رسالة فی الفطرة الالٰھیة** بھی قاضی صاحب کی طرف منسوب ہے (۲۸)۔ آخرالذکر تینوں رسالوں کی نسبت تحقیق طلب ہے، صرف کیٹلاگ میں ان کا نام کافی نہیں۔ ان کے علاوہ بھی دو کتابوں کا انکشاف قاضی صاحب کے سوانح نگاروں نے خود ان کی تصنیف سے کیا ہے۔ **الرسالة فی الفطرة الالٰھیة** جس میں اصول غامضہ مذکور ہیں، نیز مسئلہ اختیار پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں خود مصنف کے الفاظ ہیں "**وانھا اجدی من تفاریق العصا**" جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسلم الثبوت میں ایک رسالہ "**الافادات**" کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس کتاب میں بعض جگہ لکھتے ہیں "**وقد فرغنا عنھا فی السلم والافادات**" کہا جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے سلم العلوم کی منہیات بھی لکھی تھیں۔ ممکن ہے "**الافادات**" کے لفظ سے اسی کی طرف اشارہ ہو۔

قاضی صاحب اور تصوف وسلوک: قاضی محبّ اللہ بہاری ایک طرف جہاں علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے وہیں سلوک ومعرفت کی راہ سے بھی بیگانہ نہ تھے۔ علوم عقلیہ میں عروج و ارتقاء کی آخری منزل پہنچنے کے بعد قاضی صاحب نے اپنے ایک ہم وطن بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اس طرح وہ شریعت وطریقت دونوں کے مجمع البحرین تھے۔ قاضی صاحب کا یہ وہ

امتیاز ہے جو عام طور پر علمائے معقولات اور ارباب فلسفہ وحکمت کی صف میں کم نظر آتا ہے۔

قاضی صاحب کا علمی مقام ومرتبہ اور خصوصیات: قاضی صاحب کی عقلی ونقلی علوم میں دسترس ومہارت اہل علم کے درمیان کسی تذکرہ کی محتاج نہیں۔ قاضی صاحب کی عظمت و رفعت کو ان کے سوانح نگار علامہ آزاد بلگرامی نے دریا بکوزہ کے مصداق اپنے دو بلیغ و جامع لفظوں میں بیان کرکے ان کی علمی عظمت کا مرقع پیش کردیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں "**القاضی بدر بین النجوم وبحر بین العلوم**"۔ آزاد بلگرامی کے ان دو لفظوں سے قاضی صاحب کے مقام ومرتبہ اور عظمت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح صاحب نزہۃ الخواطر نے قاضی صاحب کے تذکرہ کا آغاز "**احد الاذکیاء المشھورین فی الآفاق**" کے جامع الفاظ سے کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ خداداد ذہانت وطباعی کی جو خصوصیات قاضی صاحب کو ودیعت ہوئی تھیں، وہ خال خال ہی کسی کے حصہ میں آتی ہیں۔ ان کی تصانیف کی سطر سطر اس کی شہادت پیش کرتی ہے۔ قاضی صاحب کے ایک تذکرہ نگار لکھتے ہیں:

> "قاضی محبّ اللہ بہاری کا ذہن رسا اور فکری صلاحیت بہ درجہ اتم حاصل تھی۔ آپ کا ذہن تقلیدی نہیں بلکہ خلاقی تھا۔ آپ جدت پسند تھے، آپ نے سلم العلوم کا آغاز ہی انوکھے ڈھنگ سے کیا ہے"۔ (۲۹)

جناب اسحاق بھٹی صاحب لکھتے ہیں:

> "ہندوستان کی سرزمین کو جن اجلہ علماء کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا ان میں قاضی محبّ اللہ بہاری کے نام نامی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کو اللہ نے خوب شہرت عطا کی اور اپنے معاصرین میں نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اسی دور میں ان کتابوں کو درس نظامیہ میں شامل کیا گیا اور ان کے حواشی وشروح معرض تحریر میں لائے گئے"۔ (۳۰)

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کا شمار عہد جہاں گیری کے نامور فضلاء میں ہوتا ہے۔ فقہ واصول فقہ ان کا علمی اثاثہ تھا اور منصب قضاء سے طویل مدت تک وابستگی نے مزید ان کے تجربات میں اضافہ اور علم میں پختگی پیدا کی ہوگی لیکن اس کے باوجود قانون اسلامی

کی ترتیب وتدوین کے لیے علماء کی جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی (جو بعد میں فتاویٰ عالم گیری کی شکل میں سامنے آئی) اس میں قاضی صاحب کا نام نظر نہیں آتا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے جناب مولانا عمادالدین قاسمی لکھتے ہیں:

> ''اس کا جواب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا کہ چونکہ قاضی صاحب کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ اوراس کے بعد حیدرآباد کے قاضی بنائے گئے جو مرکز سے کافی دور تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کو اپنے پوتے کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک قابل اور باصلاحیت عالم کی ضرورت تھی، لہٰذا وہ اس کے پوتے کی تعلیم وتربیت کے لیے حیدرآباد کے بعد کابل چلے گئے......اس طرح قاضی صاحب فتاویٰ کی تدوین میں شریک نہیں ہوسکے''۔(۳۱)

حواشی

(۱) سبحۃ المرجان، ص ۱۹۸، مطبوعہ علی گڑھ۔ (۲) شرفاء کی نگری، ج ۲، از قیام الدین نظامی فردوسی، مطبوعہ نظامی اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۴، ص ۱۷۷۔ (۳) نزہۃ الخواطر (الاعلام بمن فی الہند من الاعلام)، ج ۶، ص ۳۹۔ (۴) ملاحظہ ہو شرفاء کی نگری، ص ۱۷۷۔ (۵) سبحۃ المرجان، ص ۱۹۸۔ (۶) فقہائے ہند، ص ۹۹۔ (۷) معارف، اکتوبر ۱۹۳۹ء، بحوالہ مآثر الکرام۔ (۸) سبحۃ المرجان، ص ۱۹۸۔ (۹) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۔ (۱۰) معارف، اگست ۱۹۷۲ء، حافظ امان اللہ بنارسی۔ (۱۱) حوالہ بالا، ص ۱۱۲۔ (۱۲) سبحۃ المرجان، ص ۱۹۸۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۹۸۔ (۱۴) ایضاً، ص ۵۸۔ (۱۵) مآثر الکرام، ص ۲۱۱، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۱۰ء۔ (۱۶) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۵۔ (۱۷) مخزن الانساب، ص ۲۰، مطبوعہ پٹنہ، ۱۳۳۹ھ۔ (۱۸) تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمان علی، مرتبہ ایوب قادری، مطبوعہ کراچی، ص ۴۵۔ (۱۹) مقالات شبلی، ص ۱۲۴۔ (۲۰) فقہائے ہند، ص ۱۰۱۔ (۲۱) مجلّہ صدی تقریبات مدرسہ منیرالاسلام بہار شریف، ۲۰۰۴ء، تذکرہ قاضی محبّ اللہ۔ (۲۲) حالات مصنّفین، ص ۱۷۶۔ (۲۳) فقہائے ہند، ص ۱۰۳۔ (۲۴) بانی درس نظامی، ص ۲۱۵ و ۱۰۶، بحوالہ رسالہ قطبیہ، مطبوعہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۷۳ء۔ (۲۵) ص ۱۹۸۔ (۲۶) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۵، نزہۃ الخواطر۔ (۲۷) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۔ (۲۸) تذکرہ کاملان بہار، مطبوعہ خدابخش لائبریری پٹنہ، مضمون قاضی محبّ اللہ از ڈاکٹر حامد علی خاں، علی گڑھ، ص ۸۲۵۔ (۲۹) حوالہ سابق۔ (۳۰) فقہائے ہند، ص ۹۹۔ (۳۱) مجلّہ صدی تقریبات مدرسہ منیرالاسلام بہار شریف۔

اخبار علمیہ

''آیۃ من آیات اللہ''

مصر کے سید مصطفیٰ کی عمر کل گیارہ برس کی ہے لیکن خداداد صلاحیت، قوت حافظہ اور محنت شاقہ کی بدولت اس نے تین ماہ میں قرآن مجید اور چھ مہینوں میں قرأت عشرہ پر مشتمل مکمل قرآن حفظ کرلیا، یہ کارنامہ بے مثال ہی کہا جائے گا، اتنا ہی نہیں اس نے ۴۰ دنوں میں بخاری، مسلم اور مفرادت البخاری کی گیارہ ہزار حدیثیں بھی یاد کرڈالیں۔ تحفۃ الاطفال، سنن الجزریہ، الشاطبیہ، الدرہ، الفیہ ابن مالک، لدنیہ ابن قیم اور جلالین وغیرہ جیسی مشکل ترین کتابیں بھی اس نے ازبر کرلی ہیں، ان دنوں وہ توریت اور انجیل کے مختلف نسخوں کو یاد کرنے اور انٹرنیٹ اور ٹی وی پر قرأۃ عشرہ کے اصولوں، علم العروض، حنفی وشافعی فقہ اور قرآن مجید کے رسم خط پر درس وتدریس میں مصروف ہے۔ متعدد عرب ملکوں اور جامعہ ازہر وغیرہ کی جانب سے اس لڑکے کو اس کے کمالات پر انعامات، تمغات اور اعزازی اسناد سے نوازا گیا ہے، اس ہونہار کی خواہش ہے کہ وہ ایک صحیح عالم کی شکل میں دین حنیف کی تبلیغی اور دعوتی خدمات انجام دے کر اپنے والد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، جون ۱۳ء)۔

''آٹزم''

آٹزم ایک قسم کی نفسیاتی خرابی ہے یہ مرض نہیں ہے۔ جرنل جاما سائیکاٹری میں شائع تحقیق کے مطابق یہ ایک موروثی خطرہ ہے جو نسل درنسل منتقل ہوتا رہتا ہے، یہ دراصل جنین میں موجود غیر متوازن خلیے اور جرثومے ہوتے ہیں جو باعث ضرر تو نہیں ہوتے مگر آیندہ نسلوں میں آٹزم کے خطرات کے امکانات ضرور بڑھا دیتے ہیں۔ اس کیفیت میں مبتلا بچے گو بے حد ذہین ہوتے ہیں مگر جب وہ عنفوان شباب میں قدم رکھتے ہیں تو دنیا انہیں ایک جنجال معلوم ہوتی ہے، انہیں خوشی ناخوشی اور پہلی ہی ملاقات میں گھل مل جانے کا صحیح شعور نہیں ہو پاتا، ایسے بچے اپنے دل پسند موضوعات پر ہی بات کرنا چاہتے ہیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ معلومات بھی اکٹھا کر لیتے ہیں، ایسے لوگ قنوطیت کا شکار تو ہوتے ہیں مگر روزمرہ کے عام معمولات سے اکتاتے بھی نہیں۔

برطانوی محکمۂ صحت کے مطابق ہر سو میں ایک بالغ آٹزم میں مبتلا ہے جب کہ امریکہ کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اسکول جانے والے ۵۰ طلبہ میں ایک بچہ آٹزم کا شکار ہے۔ عام طور پر یہ بچے زبان سمجھنے اور استعمال کرنے، تبادلۂ خیالات اور سماجی روابط استوار کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ محققین کے مطابق اس نفسیاتی خرابی سے نجات کی اب تک کوئی تدبیر واضح طور پر سامنے نہیں آئی ہے۔ تاہم ایسے بچوں سے آسان اور سادہ الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں بات کرنا ان کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ انہیں جواب دینے کے لیے وقت دینا بھی ضروری ہے۔ اقوام متحدہ نے ۲/اپریل کو ''یوم آٹزم'' کے طور پر مختص کیا ہے۔

''کف پا سیکڑوں قسم کے بیکٹیریوں کا مسکن''

ایک طبی تحقیق میں امریکی سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ٹخنوں سمیت انسانی پیر تقریباً ۲۰۰ متنوع قسم کے جرثوموں کی آماج گاہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یوں تو پورا جسم غیر مرئی جراثیم سے ہمہ وقت آلودہ ہے، مگر دوسرے اعضاء کی بہ نسبت ٹخنوں، پیر کے ناخنوں اور پیروں کی انگلیوں کے درمیان جراثیم بہت زیادہ پائے جاتے ہیں، جبکہ ابرو، کان اور سر کے پچھلے حصے، ناک کے دونوں سوراخ، سینہ، ہتھیلی اور شانوں پر بھی یہ خاصی تعداد میں ملتے ہیں مثلاً ٹخنہ پر ۸۰، پیروں کی انگلیوں میں ۴۰ اور اس کے ناخنوں میں ۶۰ ہتھیلی، کہنی اور شانوں پر ۱۸ سے ۲۰ قسم کے جرثومے موجود ہیں، کہا گیا کہ جسم پر جتنے جرثوموں کا علم ہوا ہے اس کی تعداد غیر معلوم جرثوموں سے بہت کم ہے۔ محققین کے مطابق یہ جرثومے اصلاً جلدی بیماریوں کی مدافعت کرتے ہیں مگر جب کسی سبب سے ان میں عدم توازن واقع ہوجاتا ہے تو یہی متعدی امراض کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ رسالہ نیچر میں شائع یہ تحقیق عربی کے المجتمع العلمی المغربی میں نقل ہوئی ہے، اس نئی تحقیق سے وضو کے دوران انگلیوں میں خلال کی حکمت اور صحت سے متعلق تعلیمات نبویؐ کی اہمیت کھل کر سامنے آتی ہے۔

''ترقی پذیر ممالک میں معذور بچوں کی افسوس ناک صورت حال''

صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک میں معذور افراد بالخصوص بچوں کی پیشہ ورانہ تربیت اور ذہنی اور جسمانی نشو ونما کے لیے خصوصی تربیتی مراکز قائم ہیں، جن میں بہترین سہولتیں مہیا کرائی جاتی ہیں لیکن

دنیا کے اور خطوں خاص طور پر ترقی پذیر ملکوں میں اس جانب افسوس ناک حد تک بے پروائی برتی جاتی ہے۔ یونیسیف نے معذور بچوں کی صورت حال پر اپنی ایک تازہ رپورٹ میں عالمی ادارہ صحت کے حوالہ سے کہا ہے کہ ترقی پذیر خطوں میں محض ۱۵ فیصد معذور افراد کو ضروری اور طبی سہولتیں حاصل ہیں مثلاً مرگی کے مریض عام طور سے مناسب دواؤں سے اور معذور افراد وھیل چیئر سے محروم ہیں۔ معذور بچوں کے حقوق کے تحفظ پر ہونے والے جلسوں میں دستخط کرنے کے باوجود یہ ملک ان مسائل کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ معذور بچے صحیح علاج و نگہداشت سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

''عہد صفوی کے قالین کی نیلامی''

قالین بافی میں ایران کو نمایاں مقام حاصل ہے، قم، مشہد اور اصفہان کے دیہی علاقوں میں تیار ہونے والے قالین دنیا بھر میں انتہائی مقبول ہیں۔ العربیہ نیٹ کی خبر کے مطابق عہد صفوی کے یعنی ۳۵۰ برس قبل کے ایک ایرانی قالین کی لمبائی ۶۷ء۲ اور چوڑائی ۹۵ء۱ ہے اور اس طرح کا اس کل حجم پانچ مربع میٹر ہے اور یہ اس وقت امریکہ آرٹ میوزیم کی ملک ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل کے ایک امریکی کانگریس کارکن ولیم کلارک کو فرانس کے دورہ پر یہ قالین ملا تھا۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۲۵ء میں انہوں نے اس مذکورہ میوزیم کو ہدیہ کر دیا، قالین کے ضروری سامان کی عمدگی اور اس سے زیادہ اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے یہ آج بھی بالکل نیا اور دلکش نظر آتا ہے، اس کی بناوٹ میں ایران کے صوفیانہ رموز و اشارات پنہاں ہیں مثلاً اس کے کمان نما خمیدہ ہلال پھول مجلس سماع کے رقص کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس میں اہل تصوف ایک خاص زاویہ سے چکر لگاتے ہوئے اپنے جسم کو دیکھتے ہیں جس کا مقصد موت کو یاد کرنا ہے۔ اس میں ۱۲ رنگوں کے دھاگوں کے استعمال کے متعلق ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ سال کے ہر رنگ کے موسم کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ منفرد صنعتی کاری گری کے سبب قالین کی اہمیت و شہرت ایسی ہے کہ میوزیم کے ذمہ داروں نے امریکہ میں حالیہ سیلاب سے متاثرین کی امداد کے لیے جب اس کی نیلامی کا فیصلہ کیا تو اس کی قیمت ۱۰ ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ اس سے قبل دنیا کا سب سے گراں ''کرمان'' نامی ایرانی قالین ساڑھے نو ملین ڈالر میں لندن میں فروخت ہوا تھا۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

قاطع برہان بہ خط غالب

محلّہ پچدرہ،
نزد جنوں والی مسجد،
امروہہ، یوپی

مکرمی! سلام مسنون۔

ہندوستان کے مشہور تاجر کتب اور نوادر فروش یعنی میرے والد بزرگوار جناب توفیق احمد قادری چشتی مدظلہ العالی نے مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ قاطع برہان ۲۲/ مارچ ۲۰۱۳ء بروز جمعہ حیدرآباد سے خریدا۔ جس پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ لیکن والد محترم نے جب کہا کہ مجھے غالبؔ کا خط معلوم ہوتا ہے تب احقر نے غالبؔ کی دوسری تحریروں سے اس نسخے کو ملا کر دیکھا تو غالبؔ کا خط ثابت ہوا۔ غالبؔ کے لکھنے کا اپنا ایک جداگانہ انداز ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ غالبؔ کا املا منفرد ہے۔ علامہ پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم غالبؔ کے املا کے متعلق نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۸۴ء، لاہور کے صفحہ ۴۱ پر رقمطراز ہیں۔

> ''غالبؔ کے طرز تحریر کی کچھ خصوصیات ہیں، جنہیں ان کی تحریروں کو دیکھنے والے آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً وہ الف اور دال یا الف اور را کو ملا دیتے ہیں، یعنی فریادی، بہادر، بہار وغیرہ الفاظ اس طرح لکھیں گے کہ دال یا رے، الف ہی میں جڑی ہوئی ہوگی۔ یائے معروف ومجہول اگر بغیر وصل آئے تو سامنے کی طرف پھیلی ہوئی ہوگی یعنی لفظ شوخی، اس طرح لکھیں گے کہ یا کا آخری حصہ بڑی سی رے معلوم ہوگا۔ اسی طرح غیر مخلوط ہائے ہوّز کا سرا اتنا دبیز کر دیں گے کہ اگر اس کے نیچے شوشا نہ ہوتو اسے میم بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ دال اور واو کو ملا دینا بھی غالب کی منفرد روش ہے۔ وہ 'دو' یا 'دوری' یا ''دوست' اس طرح لکھتے ہیں کہ اس شکل کو ٹائپ میں ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ بعض الفاظ کو

ملا کر لکھنا بھی ان کی روش ہے۔ مثلاً 'محفل میں' کو یوں لکھیں گے: محفلمیں۔ اسی
طرح: مجلسمیں، جوشمیں وغیرہ''۔

اگر کسی لفظ میں دال اور واو دونوں حروف ہیں تو ان کا مجموعہ دو چشمی ہا کی طرح بھی بنا دیتے ہیں۔ جیسے افزودن میں آخری تینوں حرف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں گے۔

ب ت ٹ وغیرہ حروف وہ دو طرح لکھتے ہیں، کبھی تو دندانِ دانت، جس کا شوشہ آخر میں اوپر کی طرف اٹھتا ہوا ہوتا ہے اور کبھی اس طرح کہ مقام وصل پر وہ دبیز ہوتی ہے اور آگے بڑھتے ہوئے نکیلی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل خنجر کی سی شکل بن جاتی ہے۔

جب پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب سابق صدر شعبہ فارسی دلی یونیورسٹی دلی (ساکن ۲۳۔ ڈی، ایسٹ نظام الدین، نئی دہلی) نے ۱۸/اپریل ۲۰۱۳ء بہ روز جمعرات بعد نماز عصر مذکورہ مخطوطہ دیکھا تب پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ شواہد یہ بتلاتے ہیں کہ یہ نسخہ قاطع برہان بخط غالب ہی ہے۔ نیز فرمایا کہ میں اپنے یہ جملے کسی کے بھی سامنے دوہرا سکتا ہوں۔

میں نے ماہر غالبیات لائق صد احترام ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی خدمت میں مذکورہ نسخہ کے چند زیراکس اور زیر نظر مضمون اسپیڈ پوسٹ سے روانہ کیے تھے۔ بعدہ احقر کی موبائیل پر ۵/جون ۲۰۱۳ء بہ روز بدھ ڈاکٹر صاحب سے گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ میں پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب کے بیان سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ یہ قلمی نسخہ قاطع برہان بخط غالب ہی ہے۔

لہٰذا بزرگی و لائق صد احترام جناب ڈاکٹر خلیق انجم مدظلہ العالی نے میرے خط کا جواب ۶/مئی ۲۰۱۳ء کو لکھا جو مجھے ۱۰/جون ۲۰۱۳ء کو بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ آپ نے اس نسخے کو GEUINE لکھا ہے۔ موصوف کا خط بجنسہٖ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

۶/مئی ۲۰۱۳ء

انوار صمدانی امروہوی صاحب آداب!

آپ کا خط موصول ہوا۔ ''نسخہ قاطع برہان بہ خط غالب امروہہ میں'' میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ آپ نے غالب کی تحریروں کی املائی خصوصیات کی تفصیل کو بڑی محنت اور لگن سے بیان کیا ہے۔

آپ کے خط کا جواب دینے میں مجھے تاخیر اس لئے ہوئی کہ میں چاہتا تھا کہ ''قاطع برہان'' کے اس نسخے کی تحریر کو ''غالبؔ کے خطوط'' میں شائع ہونے والے خطوط کے عکس سے موازنہ کرسکوں۔ پانچ جلدوں میں، جو میں نے غالبؔ کے خطوط مرتب کئے ہیں۔ان میں غالبؔ کے کئی خطوط کے عکس شامل ہیں۔ چونکہ میں نے مکان تبدیل کردیا تھا۔اس لیے یہ میری کتاب بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی۔تین چار دن پہلے ہی مجھے غالبؔ کے خطوط کا وہ نسخہ ملا جو میں نے مرتب کیا تھا۔ میں نے غالبؔ کے خطوط کے عکس سے ''نسخہ قاطع برہان بہ خط غالبؔ امروہہ میں'' غالب کی تحریر کا موازنہ کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنے مضمون میں غالبؔ کی جو املائی خصوصیات بیان کی ہیں وہ بالکل درست ہیں۔اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے ''نسخہ قاطع برہان'' کا جو عکس بھیجا ہے وہ بالکل GENUINE ہے۔

آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اور میرے بھائی توفیق احمد قادری صاحب کے صاحبزادے ہیں، اس لیے میں آپ کو مشورہ دونگا کہ ''نسخہ قاطع برہان'' کو بہت عام نہ کیجئے۔آپ کو بیاض غالبؔ کا پورا قصہ معلوم ہی ہے۔کوئی بھی شخص آپ کے یہ نسخہ قاطع برہان بہ خط غالبؔ امروہہ بہ آسانی شائع کرسکتا ہے۔ جو آپ کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

امید ہے کہ آپ بہ خیریت ہوں گے۔

نیاز کیش

خلیق انجم

زیر نظر ''قاطع برہان بخط غالبؔ نسخہ توفیقیہ'' کے شروع اور آخری اوراق ملاحظہ فرمائیں:

یہ نسخہ محمد عبداللہ بن مرتضٰی کے ملک میں رہا ہے جیسا کہ سرورق پر تحریر ہے۔''مالکہ محمد عبداللہ بن مرتضٰی عفا اللہ عنہما''، ممکن ہے کہ محمد عبداللہ یا جناب مرتضٰی غالبؔ کے احباب میں سے ہوں۔ کیوں کہ عبداللہ کا ذکر غالبؔ کے حوالہ سے کافی مشہور ہے کہ انھوں نے قاطع برہان کا رد لکھا تھا۔(بحوالہ اردوئے معلّی دہلی کا غالبؔ نمبر حصہ سوم، فروری ۱۹۶۹ء صفحہ ٦٦٢ تا ٦٦٦)

کیفیت نسخہ: اوراق : ۲۰۱ =صفحات: ۴۰۲ ، زبان: فارسی ، خط: بخط غالبؔ، مسطر:

۱۱/سطری، روشنائی: سیاہ۔ برائے متن، شنگرفی۔ برائے سرخی، کاغذ: مہری (جس کارخانہ یا شہر میں یہ کاغذ بنا ہے وہاں کا مونوگرام دو مینار اور ایک گنبد اس نسخے کے کاغذ پر بنے ہوئے ہیں۔)

سائز کاغذ: 19.5x12cm سائز متن: 14.5x7cm

لائق صد احترام قاضی عبدالودود صاحب نے قاطع برہان کا نسخہ مرتب کیا اور اس کو ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا لیکن قاضی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے پیش نظر کون کون سے خطی اور مطبوعہ نسخے رہے اور نہ ہی یہ نشاندہی کی کہ قاطع برہان کے خطی نسخے کہاں کہاں موجود ہیں!

یاد رہے کہ ۵/اپریل ۱۹۶۹ء ''نسخہ دیوان غالبؔ بخط غالبؔ'' میرے والد صاحب مدظلہ العالی نے بھوپال سے دریافت کیا تھا۔ جو آج بھی رام پور کے مولانا عرشی کے خاندان کے پاس ناجائز طریقہ سے رکھا ہے۔ نیز اس کی درد بھری داستان دنیا کے علمی وادبی رسائل وجرائد اور کتب وغیرہ میں موجود ہے۔

فقط

انوار صمدانی امروہوی

صدی تقریب

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
پوسٹ بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن (بہار)
۸۴۵۴۵۳
۹/۷/۱۳ء

محترمی! زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف مئی اور جون ۱۳ء کے شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ دارالمصنّفین کی تاسیس اور علامہ شبلیؒ کی رحلت پر پورے سو سال گزرنے والے ہیں۔ ان دونوں اہم واقعات کے مدنظر دارالمصنّفین کے ارباب حل وعقد نے صدی تقریبات کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔

دارالمصنفین کے لیے یہ نہایت ہی مسرت کی بات ہے کہ اس کے قیام کے روز اولین سے اس کی باگ ڈور ایسے مخلص اور ایثار پسند علماء کے ہاتھوں میں رہی جو اپنے زمانے کے ممتاز اہل قلم اور مصنفین تھے۔ اور آج بھی (بحمد للہ) اس کے ذمہ دار انہیں اوصاف کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادارہ تقریباً ایک صدی سے پوری کامیابی کے ساتھ علمی و دینی خدمات انجام دینے ہی میں مصروف عمل ہے اور اس کی تصنیفات و تالیفات، ہند و پاک ہی نہیں بلکہ عرب اور یورپ میں بھی قابل استناد سمجھی جاتی ہیں۔

دارالمصنفین کی خدمات اور اس کے موقر رسالہ معارف کے بارے میں علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ (پیرس) اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) وغیرہم کی آراء سے اہل علم واقف ہیں۔

اپنے زمانہ کے ممتاز عالم مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ (۱۹۳۶ء-۲۰۰۲ء) نے ایک بار ناچیز سے فرمایا تھا:

> ''دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب بحیثیت معلم میرا تقرر جامعہ رحمانی مونگیر ہوگیا تو میں نے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی تصنیفات و تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ میری تحریری اور تقریری صلاحیت جو کچھ بھی ہے وہ دارالمصنفین کی کتابوں کی رہین منت ہے''۔

ماہرالقادری مرحوم (ولادت ۱۳۲۴ھ- وفات ۱۹۷۸ء) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے اندر تنقیدی صلاحیت علامہ شبلی نعمانیؒ کی شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر کے مطالعے سے پیدا ہوئی۔ انہوں نے ایک مکتوب میں ناچیز کو مذکورہ کتابوں کو بار بار مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا وہ مکتوب میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔

استاذ محترم مولانا سید نظام الدین مدظلہ (امیر شریعت بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ) نے میرے طالب علمی کے زمانے میں مجھ سے کئی بار فرمایا:

> ''علامہ شبلیؒ کی سیرت النبیؐ کی تمام جلدیں بالاستیعاب پڑھ جاؤ۔ وہ مولوی نہیں جس نے سیرت النبیؐ کا مطالعہ نہیں کیا''۔

جس ادارے کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف اپنے اپنے زمانے کے ممتاز علماء کریں اور جس کی تصنیفات و تالیفات سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہوں، اس ادارے کے کارناموں کے اعتراف میں صدی تقریبات کے انعقاد کا فیصلہ قابل صد تحسین ہے۔ انشاءاللہ دارالمصنّفین کے ذمہ داروں کی مخلصانہ کوششوں سے اس کا جشن صد سالہ ہر طرح کامیاب رہے گا۔

بڑا اچھا ہو کہ صدی تقریبات کے موقع پر اشاریہ معارف کی بقیہ دونوں جلدیں بھی منظر عام پر آجائیں۔ اشاریہ کے فاضل مرتب ڈاکٹر جمشید ندوی صاحب کو اس کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

والسلام، نیازمند

وارث ریاضی

راجہ رتن سنگھ زخمی اور قصیدہ ہفت بند......

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی
جی سی یونیورسٹی لاہور، پاکستان

مدیر محترم معارف

سلام مسنون!

آپ کا موقر جریدہ ''معارف'' شمارہ جون ۲۰۱۳ء نظر سے گذرا۔ یہ علمی اور ادبی مجلّہ تشنگان علم کے لیے ایک ساغر کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں موجود بادۂ معانی مجھ ایسے ہیچمدان کے لیے تسکین کامل کا باعث ہے۔ فارسی ادبیات کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس شمارے میں ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا مضمون ''راجہ رتن سنگھ زخمی اور قصیدہ ہفت بند در منقبت شیر خدا امیر المومنین حضرت مولی علی کرم اللہ وجہہ'' خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ بندہ جی سی یونیورسٹی لاہور میں راجہ رتن سنگھ زخمی کے دیوان کی تدوین و تصحیح کے موضوع پر پی ایچ ڈی اسکالر ہے اور جولائی ۲۰۱۳ء مقالے کی تکمیل کا مہینہ ہے۔ مجھے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اس دیوان کے دو خطی نسخے ملے۔ ان میں ایک خطی نسخے میں رتن سنگھ زخمی کا مذکورہ ہفت بند دیوان غزلیات کے شروع میں موجود ہے لیکن اس کے بعض اشعار کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے ناخوانا ہیں۔

میں آپ کے اس جریدے اور خصوصاً ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ اس مضمون کی اشاعت سے مجھے اس ہفت بند کی تصحیح میں قدرے مدد ملی۔ بعض ناخوانا اشعار کی اس مضمون کی مدد سے تصحیح کی گئی لیکن ابھی تشنگی باقی ہے۔ میری استدعا ہے کہ ازراہ کرم ماہ جولائی یا اگست کے شمارے میں اس ہفت بند کو چھاپ دیا جائے تو یہ آپ کی طرف سے ایک عظیم علمی خدمت ہوگی۔

ممنون احسان

بابر نسیم آسی

جہان شبلی

۵۸، نیو آزاد پورم کالونی،
چھاؤنی اشرف خان، عزت نگر،
بریلی۔۲۴۳۱۲۲

۱۷/۷/۱۳ء

برادرم مکرم سلام مسنون

مزاج گرامی!

آج کی ڈاک سے معارف کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ جہان شبلی کی اشاعت کا شکریہ۔ میں نے یہ مضمون اسکینگ کرا کے ای میل کے ذریعے آپ کو ارسال کیا تھا۔ اسکینگ میں اکثر صفحے کی آخری سطر مدھم یا حذف ہوجاتی ہے، اس مضمون کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تین مقامات پر عبارتیں چھوٹ گئی ہیں جس سے مضمون کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے، وہ مقامات یہ ہیں:

صفحہ ۴۲، سطر۔''قبول کرلیا تھا'' کے بعد یہ عبارت چھوٹ گئی۔''اردو اخبارات نے اسے ایک خوش آیند خبر کے طور پر درج کیا۔ بدایوں سے شائع ہونے والا ہفتہ وار ذوالقرنین نے''......

صفحہ ۴۳، سطر ۱۴ کے بعد نمبر (۶) کا اندراج اور یہ عبارت ''نظامی بدایونی نے اپنی تالیف قاموس المشاہیر، ج ۲/ (بدایوں ۱۹۲۶) میں مولانا شبلی کا ترجمہ دیا ہے، ترجمہ حسب ذیل ہے''......

صفحہ ۴۵، سطر ۲، ''مسکت جواب ہے'' کے بعد یہ عبارت چھوٹ گئی۔'' کیونکہ ان دونوں

عبارتوں کا زمانہ تحریر ۱۹۲۶ء ہے''۔

اس کے علاوہ صفحہ ۷۴ سطر ۶ میں اضطراب و بدحواسی کی جگہ اضطراب وحواشی درج ہوگیا ہے۔قارئین ان مقامات کی تصحیح فرمالیں۔

صفحہ ۷۴ پر شق نمبر ۸ کے تحت جو پہلا خط بہ نام وقار الملک نقل ہوا ہے۔اس کا صرف عکس شائع کرنا مقصود تھا۔راقم الحروف کی غلطی سے وہ غیر مطبوعہ خطوط میں شامل ہوگیا۔اطلاعاً عرض ہے کہ یہ خط نقوش مکاتیب نمبر لاہور (ص ۱۸۹) باقیات شبلی (۲۰۴) مکتوبات شبلی (۳۹) میں شامل ہے۔

شمس بدایونی

صدی تقریب

گلشن عتیق، مسجد عمر بن خطاب،
نیو عظیم آباد کالونی، سینچرا باغ،
مہیندرو، پٹنہ (بہار) ۸۰۰۰۰۶
۱۱؍جولائی ۱۳ء

بحمد للہ آج رمضان المبارک کی پہلی تاریخ ہے۔آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

میں دو ماہ تک دہلی میں رہا اور علیل رہا، اس لیے معارف کے حالیہ شماروں کے دیدار سے محروم رہا، اب جبکہ وہاں سے گھر واپس آچکا ہوں، اپریل، مئی، جون کے شمارے میرے سامنے ہیں، انہیں کے شذرات، اخبار علمیہ، مقالات اور دیگر علمی وادبی مباحث کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔

بڑا لطف آتا ہے، علمی تشنگی بجھتی ہے اور بھڑکتی بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ دارالمصنّفین کی دیگر تصنیفی خدمات کو الگ کر کے دیکھا جائے تو صرف معارف قریب سو سال سے علمی، دینی، تحقیقی، ادبی میدان میں ایسی خدمات انجام دے رہا ہے، جس کی مثال اردو کیا فارسی و عربی زبان میں بھی بڑی مشکل سے ملے گی، بلکہ اگر بے مثال کہوں تو بے جا نہ ہوگا، ایسے اہم ادارے کی صدی تقریب ضرور منائی جانی چاہیے، جیسا کہ میرے بزرگ دوست پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے ایک جگہ شذرات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس سلسلے میں میرے لائق جب اور جو خدمت ہو آپ بلا تکلف ہدایت فرمائیں، میرے لیے سعادت کی بات ہوگی۔

میرے پاس مولانا عبدالماجد دریابادی اور شاہ معین الدین احمد ندوی کے تقریباً ۳۰، ۳۵ خطوط محفوظ ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو چند اہم خطوط مضمون کی صورت میں مرتب کر کے معارف کے لیے بھیج دوں تاکہ یہ محفوظ ہو جائیں اور علمی دنیا ان سے واقف ہو۔

میری ایک تازہ تصنیف ''عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات'' کے نام سے چھپی ہے، اس کی دو کاپی معارف میں تبصرہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

والسلام

عتیق الرحمٰن

''نقوش رفتہ''

۱۵/ جولائی ۲۰۱۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر ہوں۔ اتفاق سے مئی، جون دو ماہ سے کچھ اوپر لکھنؤ سے باہر رہا۔ بیٹا رشید اطہر کے پاس دوحہ (قطر) ایک ماہ رہا اور کچھ وقت بمبئی میں گزرا۔ واپس آکر حیدرآباد چلا گیا جہاں خاندان میں ایک تقریب میں شرکت ضروری تھی۔ ۴/ جولائی کو واپس آنے پر آپ کی حوصلہ افزا تحریر معارف (مئی شمارہ) میں کتاب ''نقوش رفتہ'' پر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی ہیں، جن کے لیے شکر گذار ہوں۔ پروف ریڈنگ میں عجلت کے سبب یہ غلطیاں رہ گئیں جنہیں انشاءاللہ درست کر دی جائیں گی۔

وہ پیڑھی جس نے آزادی سے قبل و بعد کے آئے انقلابات کو نہ صرف دیکھا بلکہ وقت کی تیز و تند اور ناروا گرم ہواؤں کا پوری قوت سے مقابلہ کیا، ان وقتوں کے لوگ اور ان کی فکر و کارنامے قابل ستائش ہیں۔ جنہیں دیکھا اور ان کی قربت کا شرف حاصل ہوا اور نوازشات سے بہرہ ور ہوا، انہیں پر اپنی کم مائگی کے باوجود لکھنے کی جسارت کی۔

آپ اور جملہ اراکین دارالمصنّفین کو اللہ رمضان المبارک کی برکتوں سے نوازے۔ اب انشاءاللہ اکتوبر تک ارادہ ہے دارالمصنّفین کی زیارت کا۔ دعاؤں کا طالب۔

مخلص

شاہد عمادی

ادبیات

آؤ دعا کریں

فاخرؔ جلال پوری

فتنوں کا کاروبار ہے آؤ دعا کریں ہر سو اک انتشار ہے آؤ دعا کریں

تہذیب ، رکھ رکھاؤ اور آداب زندگی نسلوں پہ جیسے بار ہے آؤ دعا کریں

موج نسیم ، باد صبا کے لیے بھی اب ہر پھول جیسے خار ہے آؤ دعا کریں

اک حق پرست عام نگاہوں میں ان دنوں جیسے گناہ گار ہے آؤ دعا کریں

ہر ہر قدم پہ گلیوں میں اور شاہراہ پر تہذیب شرمسار ہے آؤ دعا کریں

اکثر خطیب شہر کا ارشاد عالیہ لفظوں کا اک حصار ہے آؤ دعا کریں

افسوس صرف لقمۂ تر کی ہوس میں آج انساں ذلیل و خوار ہے آؤ دعا کریں

مال و متاع ، جاہ و حشم کا بس اک جنوں اعصاب پہ سوار ہے آؤ دعا کریں

اپنا ضمیر بیچنے والا ہی آج کل لوگوں میں ذی وقار ہے آؤ دعا کریں

مکر و فریب اور ریا کاریوں کا شغل اب وجہِ افتخار ہے آؤ دعا کریں

دھرتی پہ رہ کے کرتے ہیں بات آسمان کی یوں زیست سے فرار ہے آؤ دعا کریں

اللہ رے حقوق و فرایض کا ہر عمل اک دوسرے پہ بار ہے آؤ دعا کریں

فاخرؔ انا کی پیاس بجھانے کے واسطے
ہر شخص بے قرار ہے آؤ دعا کریں

پوسٹ جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر، (یوپی) ۲۲۴۱۴۹۔

مطبوعات جدیدہ

فتاوی دار العلوم دیوبند (جلد ۱۳،۱۴): افادات مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مرتب مفتی محمد امین پالن پوری، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات بالترتیب، ۵۴۴، ۵۱۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دار العلوم دیوبند، یوپی ۲۴۷۵۵۴۔

دیوبند کا دار العلوم ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑوں کی مضبوطی نے اس کی ہر شاخ کو برگ آور وثمر بار بنادیا، اس کا شعبہ افتاء بھی اسی حقیقت کی ایک مثال ہے، ہند بیرون ہند کے بے شمار مذہبی وملی مسائل میں دیوبند نے اب تک مسلسل رہنمائی کا جو فریضہ انجام دیا وہ واقعی لائق فخر ہے، عام مسلمانوں کا یہ امتیاز واعتماد اگر قائم ہوا تو اس کی وجہ بھی ہے کہ دیوبند کی مسند افتاء پر ایسے علماء متمکن ہوئے جن کو علم وفضل کے ساتھ امانت ودیانت اور معاملہ فہمی کی صلاحیت ودیعت ہوتی رہی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اسی صاحب علم وفہم طبقہ کے سرخیل یعنی مفتی اول ہیں، فتاوی یا مرتبین کی تعبیر میں ارشادات ہمارے پیش نظر ہیں، اس سے پہلے بارہ جلدیں، ارکان اسلام اور نکاح وطلاق قصاص وحدود جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں، پیش نظر جلدوں میں ترکہ وتجارت میں بٹوارے اور شرکت، مضاربت، وقف، مساجد، قبرستان، خرید وفروخت، سود، جوا، بیمہ وغیرہ بے شمار مسائل آگئے ہیں، ان فتوؤں کا زمانہ قریب سو سال پہلے کا ہے، لیکن اکثر مسائل میں تازگی کا احساس ہوتا ہے، وجہ شاید یہ ہو کہ حضرت مفتی عثمانیؒ کا انداز بڑا حکیمانہ ودلنشیں ہے، وہ مسئلہ کی اصل ماہیت سے واقف کراتے ہوئے مستفتی کے ذہن اور معاملہ کے پس منظر کی واقعیت کو نظر میں رکھتے تھے، مثلاً ایک سوال پوچھا گیا کہ جو شخص جاہل ہو اور صوم وصلاۃ کا پابند نہ ہو اس کو متولی مسجد یا مہتمم مدرسہ مقرر کرنا درست ہے یا نہیں؟ جواب کا انداز ملاحظہ ہو کہ ''متولی ایسے شخص کو بنانا چاہیے جو خائن نہ ہو اور کار تولیت اچھی طرح انجام دے سکے، اس قدر تو ضروری ہے اور بہتر یہ ہے کہ نیک آدمی کو جو کہ پابند احکام شریعت ہو اور تولیت کا کام بھی انجام دے سکے، متولی بنایا جائے''۔ بعض مسائل سے وقت کے تغیر وتبدل کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً فونوگراف کے ذریعہ نعتیہ مضامین اور قرآن مجید سننے کے متعلق کہا گیا کہ یہ ایک باجا ہے اس میں کچھ سننا درست نہیں، اسی

طرح کہیں کہیں زبان کا بھی معاملہ ہے جیسے ایک جگہ یہ عبارت کہ ''جائز ہے بہ شرطیکہ وہ سائل تخطی رقاب نہ کرتا ہو'۔ ان بیش قیمت فتاوی کے مسودات کس طرح مبیضوں میں لائے گئے، تصحیح اور حوالوں کی تخریج کیسے کی گئی اور کن حضرات کی توجہ سے یہ قیمتی سرمایہ آج طباعت کی حفاظت میں آیا یہ ساری تفصیلات فاضل مرتب کے قلم سے آگئی ہیں، تعلیقات وحواشی بھی بڑے کام کے ہیں، سماع موتی کے اقرار وانکار کی بحث میں مولانا نانوتوی کی یہ تطبیق برمحل پیش کی گئی کہ اسماع ممکن نہیں سماع ممکن ہے۔ ایک جگہ ملاجیون کے وطن امیٹھی کو رائے بریلی کا معروف قصبہ بتایا گیا ہے، یہ تسامح ہے ملاجیون کا امیٹھی رائے بریلی والا نہیں، اناؤ والا ہے۔

نقوش جاوداں: از پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم، تقدیم وترتیب از ڈاکٹر شباب الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲۸۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ اور مئو، سرائے میر اوراعظم گڑھ کے مکتبے۔

علی گڑھ سے تعلق رکھنے والی گیارہ ہستیاں یا پھر اس دانش کدہ کے آسمان پر رقصاں وفروزاں گیارہ ستارے یا سیارے جن کے متعلق فاضل مصنف کے تاثرات اس جزم کے ساتھ ہیں کہ **رأیت احد عشر کوکباً** ۔ پروفیسر عبدالعلیم، آرزو صاحب، پروفیسر شمیم جے راج پوری، ذاکر علی خاں، ابن فرید، اسرار احمد، حبیب خان، حافظ غلام مصطفیٰ، سید امین اشرف، ڈاکٹر اخلاق احمد اور ایک وہ جو اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار ہوئے یعنی انور صدیقی جونپوری، ان میں سے کچھ زندہ ہیں اور کچھ وہ ہیں جو غروب کے بعد بھی تابندہ ہیں، زندگی اور موت سے پرے ان سب میں ایک رشتہ یعنی علی گڑھ کا رشتہ، مشترک ہے، جائسی صاحب بقول فاضل مرتب علی گڑھ کے پیکر میں ڈھلتے تھے، اس لیے علی گڑھ کے آسمانوں میں خیالوں کی پرواز کے لیے کند ہم جنس باہم جنس پرواز کی شرط پر پورے تھے، ہوا بھی یہی وہ پروفیسر عبدالعلیم ہوں یا بابا امین اشرف، جائسی صاحب کی مرقع آرائی نے ہر شبیہ کو دیکھنے ہی کے نہیں دل میں اتر جانے کے لائق بنا دیا، مقدمہ میں سوانح نگاری، تذکرہ نگاری، خاکہ نگاری وغیرہ پر فاضلانہ بحث کرکے ان مرقعوں کو خاکوں سے تعبیر کیا گیا ہے یہ خاکے نہ بھی ہوں لیکن لکھنے والے نے جس طرح ان کو دیکھا، پایا، پرکھا، اس کا بے ساختہ اور برجستہ، سچا اور سادا اظہار واقعی خاک کے پتلوں کو نورانی ضرور بنا دیتا ہے،

کہیں شوخی اور کہیں محبت آمیز طنز یہ جملوں کی موجودگی، علی گڑھ کے مخصوص اور مستقل خانگی ماحول کو اور زیادہ توجہ کے لائق بنا جاتی ہے، کیسے کیسے جملے ''سرسید کے عہد حیات سے آج تک سرسید کے مخالفین کف در دہاں ہوئے، سرسید زندگی بھر اپنے مخالفین کو جوابات دے کر اپنی برتری ثابت کرتے رہے، ان کے بعد ان کے اخلاف معنوی ان کی سنت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، سرسید کے بعد جن لوگوں کے ہاتھوں میں ایم اے او کالج اور مسلم یونیورسٹی رہی وہ بھی برتری کے خناس میں دست و گریباں ہے۔ وقار الملک اور حضرات کو (؟) کو مٹھ کا درجہ حاصل تھا، بقیہ مشت خاک کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی یہ ''حشرات الارض'' کی طرح کبھی ادہر تو کبھی ادہر ''جلوہ فرما'' ہوتے''۔

پروفیسر عبدالعلیم کے ذکر میں بقول جائسی صاحب یہ تمہید ناگزیر تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ بقیہ ہستیوں کے ذکر میں بھی یہ فکر کام آنے والی ہے، جائسی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جس کے متعلق جو رائے قائم کرتے اسے اندیشہ سود و زیاں سے بے نیاز ہوکر کہہ گذرتے، شروع میں ایک محترم ناقد کی یہ رائے علاحدہ اور نمایاں پیش کی گئی ہے کہ کبیر صاحب کا اسلوب ٹھنڈا اور جارحیت سے بالکل عاری ہے، ہماری نظر میں جارحیت اگر نہیں تو یہ جراحیت سے خالی بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جراحیت کا عمل حالت جذب کا مرہون ہو، جیسے ایک جگہ انہوں نے علی گڑھ کے سمسٹر سسٹم کو جہل افروز بتایا اور طلبہ اور اساتذہ کی غیر سنجیدگی کو معیار تعلیم کے پست تر ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے اچانک محسوس کیا کہ ''میں عالم جذب میں کہاں سے کہاں نکل آیا'' مختار الدین آرزو پر ان کی تحریر بھی شاید اسی عالم جذب کی ہے جس میں انہوں نے بعض مفروضات کی عمارتیں اپنی طبعی شرافت اور پاس ناموس کی قوت سے ڈھادیں۔ بات میں بات نکالنے کی معصومانہ ادا یا تو مولانا گیلانی کے اسلوب کی خاصیت تھی یا پھر اس کا لطف جائسی صاحب کی تحریروں میں آتا ہے۔ خوب ہوا جو ان تحریروں کو ان کے سعادت مند اور لائق شاگرد نے سمیٹ کر شائع کردیا، البتہ ''حاسوبی کتابت'' پر ذرا اور توجہ کی ضرورت تھی، نچلے نہ بیٹھے کو نہ چلے نہ بیٹھے لکھنا اور شپرہ چشموں کو شب پردہ چشموں لکھنا، ظلم کے سوا اور کیا ہے۔

ع-ص

رسید کتب

۱-آزادی کے بعد اردو میں عربی ادب کے جائزے: ڈاکٹر محمد شارق، ادبستان پبلی کیشنز، A-170 گراؤنڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔ قیمت: ۳۳۰ روپے

۲-اسلامی علوم کا ارتقاء عہد سلطنت کے ہندوستان میں: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئیوالان، نئی دہلی۔ قیمت: ۱۲۰ روپے

۳-انفرادیت کی تلاش: ڈاکٹر آفاق فاخری، محلّہ قاضی پورہ، جلال پور، امبیڈکر نگر۔ قیمت: ۱۴۰ روپے

۴-دار المصنّفین کی عربی خدمات: ڈاکٹر محمد عارف اعظمی عمری، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

۵-رقص غبار (شعری مجموعہ): ڈاکٹر کلب حسن حزیں، سکراول ٹانڈہ، امبیڈکر نگر، یوپی۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

۶-عمر عائشہؓ پر ایک نظر: علامہ قاری حافظ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی، عبدالرحمٰن ادیب، ۱۶۳، ملتانیان، کیرانہ، مظفر نگر، یوپی۔ قیمت: ۳۰ روپے

۷-لالۂ صحرائی: حنیف ترین، ۱۷-۲۳/۴۰، گڑگاؤں، ہریانہ۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۸-سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، کمال بک ڈپو، مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، ضلع مئو۔ قیمت: ۴۱۶ روپے

۹-محمد ایوب واقف۔ایک مطالعہ: ڈاکٹر سیفی سرونجی، محمد ایوب واقف، سی کوئن ایوینو، بی بلڈنگ، فلیٹ نمبر ۷۰۵، ساتواں فلور، سیکٹر نمبر ۱۴، کپور کھیرنہ، نیوممبئی۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

۱۰-ناگپور سیاسی تاریخ کے تناظر میں: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

۱۱-نظام تعلیم وتربیت، اندیشے، تقاضے اور حل: محمد واضح رشید حسنی ندوی، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنؤ۔ قیمت: ۱۰۰ روپے